وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں ٹھہراتا کیونکہ نفس تو یقیناً بدی کا حکم دیتا رہتا ہے مگر جس پر میرا رب رحم کرے، میرا رب حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1553)

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾

اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لے آؤ میں اسے اپنے لیے خاص کرلوں۔ پس جب اس سے گفتگو کی کہا آج تو ہمارے ہاں صاحب مرتبہ امین ہے۔ (1554)

1553 - **راستبازوں کا طریق:** یہ آیت بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ یہ عزیز کی عورت کا کلام نہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب اس قدر اپنی بریت پر زور دیا تو یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ آپ اپنی بریت کو اس طرح قائم کرنے میں گویا اپنے لیے اس مرتبہ کا دعویٰ کرتے ہیں جو کبھی کسی راستباز نے نہیں کیا کہ میرا نفس ایسا پاک ہے کہ اس سے نافرمانی ہوسکتی ہی نہیں۔ اس لیے آپ نے ساتھ ہی اس طرف توجہ دلائی کہ یہ محض اللہ کے فضل سے ہے کہ اس نے مجھے اس قدر بدی سے دور رہنے کی توفیق دی۔ یہ کوئی میرے نفس کی خوبی نہیں۔ کیونکہ نفس انسانی تو سب انسانوں کا یکساں ہی ہے اور اس کی پہلی حالت یہی ہوتی ہے کہ وہ بدی کا حکم کرتا رہتا ہے۔ ہاں جن پر اللہ کا رحم ہوتا ہے ان کا نفس یا پہلے سے ہی سدھرا ہوا ہوتا ہے جیسے انبیاء کی حالت میں کہ وہ معصوم ہوتے ہیں اور بعض اولیاء کی حالت میں کہ وہ محفوظ ہوتے ہیں اور یا بعد میں اصلاح پر آجاتا ہے۔ انسان کی پہلی یعنی حیوانی حالت کا نام یہاں **نفس امارہ** رکھا گیا ہے گویا ابھی حیوانیت اس پر غالب ہے۔ دوسری حالت کا نام **نفس لوامہ** ہے یعنی اس حالت میں اگر کبھی ارتکاب معصیت کا ہوجائے تو نفس ملامت کرتا ہے اور معصیت پر راضی نہیں ہوتا اور تیسری کا نام **نفس مطمئنہ** اور یہ کامل اصلاح کی حالت ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں پر چلتا ہے۔

1554 - اَسْتَخْلِصْ۔ اِستَخْلَصَ اور اَخلَصَ ایک معنی میں آتے ہیں۔ [اَخلَصَهٗ اَختَارَهٗ] یعنی اسے اختیار کرلیا یا چن لیا۔ (ل) اور ﴿خَلَصُوْا نَجِيًّا﴾ [80] میں خَلَصُوْا کے معنی ہیں: [اِنْفَرَدُوْا خَالِصِيْنَ عَنْ غَيْرِهِمْ] (غ) یعنی الگ ہوگئے ایسی حالت میں کہ دوسرا کوئی ان سے ملا ہوا نہ تھا۔

مَكِيْنٌ کے معنی ہیں [بَيْنَ الْمَكَانَةِ] یعنی جس کا مرتبہ اور عزت واضح ہو۔ (ل) اور ﴿ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ﴾ [التکویر: 20:81] ''طاقت والے صاحب عرش کے نزدیک مرتبے والے پر'' میں مَكِيْنٍ کے کیے ہیں [مُتَمَكِّنَ ذِيْ قَدْرٍ وَ مَنْزِلَةٍ] (غ) یعنی قدر و مرتبہ والا۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾

(یوسف نے) کہا مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دو، میں نگہبان خبر دار ہوں۔(1555)

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

اور یوں ہم نے یوسف کو ملک میں طاقتور بنایا، وہ اس میں جہاں چاہتا اختیار رکھتا تھا۔ ہم اپنی رحمت سے جسے چاہتے ہیں پہنچاتے ہیں اور ہم احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور بلا شبہ آخرت کا اجر ان کے لیے بہتر ہے جو ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

وَ جَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور یوسف کے بھائی آئے پھر اس کے پاس گئے تو اس نے ان کو پہچان لیا اور وہ اسے نہ پہچان سکے۔(1556)

1555- **حضرت یوسفؑ کا مصر پر مالی تصرف:** حضرت یوسف کی جب بادشاہ نے خود عزت افزائی کی تو انہوں نے ملک کے خزانوں یعنی مالی حالت کا انتظام اپنے لیے طلب کیا اس لیے کہ آنے والے قحط کے مقابلہ پر اس کی ضرورت تھی کہ مالی انتظام امین اور سمجھ دار ہاتھوں میں ہوتا۔ اسی کی طرف حفیظ اور علیم میں توجہ دلائی ہے۔ دینداری اور راستبازی اس کا نام نہیں کہ تسبیح لے کر دنیا سے الگ ہو کر بیٹھ رہے بلکہ دنیا کے کاروبار کو اور خدمات ملکی کو امانت کے ساتھ سرانجام دینا بھی اعلیٰ درجہ کی راستبازی ہے۔ بائبل میں اس موقعہ پر ہے کہ بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کل اختیارات حکومت دے دیئے تھے۔ قرآن شریف نے ﴿اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ﴾ فرمایا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مالی تصرف ہی اصل حکومت ہے۔ آج یورپ کی طاقتیں جب کسی سلطنت کو دبانا چاہتی ہیں تو پہلے اس کے مالی معاملات میں دخل دینا شروع کرتی ہیں جس کی ابتدا قرضہ دینے سے ہوتی ہے۔

1556- بہت سے درمیانی واقعات کو چھوڑ دیا ہے۔ فراخی کے سات سال گزر جاتے ہیں اور قحط شروع ہوتا ہے۔ غلہ کی تلاش میں یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر میں آتے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ مگر چونکہ آپ محض بچے تھے جب ان سے جدا ہوئے اور حالات میں بہت تغیر آ چکا تھا اس لیے وہ آپ کو نہ پہچان سکے۔

وَ لَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾

اور جب انہیں ان کے سامان سے تیار کر دیا کہا اپنے اس بھائی کو بھی میرے پاس لاؤ جو تمہارے باپ کی طرف سے ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں ماپ بھی پورا دیتا ہوں اور اچھی طرح اتارتا ہوں۔ (1557)

فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾

لیکن اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو تمہیں میرے پاس سے (غلہ کا) ماپ نہ ملے گا اور میرے پاس نہ آؤ۔

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

انہوں نے کہا ہم اس کے باپ کے ارادے کو پھیریں گے اور ہم (یہ) کر کے ہی رہیں گے۔

وَ قَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور اس نے اپنے نوکروں سے کہا کہ ان کا سرمایہ ان کی بوریوں میں رکھ دو کہ جب وہ اپنے گھر والوں کی طرف واپس جائیں تو اسے پہچان لیں تاکہ پھر واپس آئیں۔ (1558)

1557 - ﴿جَهَّزَ﴾۔ جَهَازٍ۔ جَهَّازٍ وہ سامان وغیرہ ہے جو تیار کیا جائے اور تَجْهِيْزٌ اس کا اٹھانا یا بھیجنا ہے۔

﴿كَيْلَ﴾۔ غلہ کے ماپ سے مخصوص ہے [دیکھو نمبر:1120]۔ اس لیے غلہ کے لیے بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔

مُنْزِلٌ۔ نُزُوْلٌ کے معنی حلول یا اترنا ہیں اور نَزِيْلٌ مہمان۔ نُزُلٌ ضیافت یا مہمانی کا سامان ہے۔ اسی لحاظ سے اِنْزَالٌ مہمان نوازی کرنا ہے اور مُنْزِلٌ جو مہمان نوازی کرتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے بات چیت کر کے سب حالات ان سے دریافت کر لیے اس لیے بھائی کو ساتھ لانے کا حکم دیا اور ماپ پورا دینا اور مہمان نوازی کا ذکر بطور احسان جتانے کے لیے نہیں بلکہ اظہار واقعات کے لیے ہے تاکہ وہ دوبارہ آئیں۔ مہمان نوازی عرب کی خاص صفت رہی ہے اس لیے مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی مہمان نوازی کی برابری کوئی نہ کر سکتا تھا۔

1558 - رِحَالٌ۔ رَحْلٌ کی جمع ہے۔ وہ چیز جو سواری کے اونٹ پر رکھی جائے اور کبھی اس سے اونٹ بھی مراد لیا جاتا ہے اور کبھی وہ چیز جس پر منزل میں بیٹھا جائے اور رِحْلَةٌ کے معنی ارتحال یا کوچ کرنا ہے ﴿رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ﴾ [القریش: 2:106] ''جاڑے اور

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾

پس جب وہ اپنے باپ کے پاس واپس گئے کہا اے ہمارے باپ! غلہ ہم سے روک دیا گیا ہے اس لیے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج کہ ہم غلہ لائیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں۔ (1559)

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾

کہا کیا میں اس کے لیے تمہارا اعتبار کروں مگر اسی طرح جیسے پہلے اس کے بھائی کے بارے میں تمہارا اعتبار کیا تھا سو اللہ ہی بہتر نگہبان ہے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ (1560)

وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَ نَمِيْرُ اَهْلَنَا وَ نَحْفَظُ اَخَانَا وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾

اور جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا اپنے سرمایہ کو اپنی طرف لوٹایا ہوا پایا کہا اے ہمارے باپ ہم (اور) کیا چاہتے ہیں یہ ہمارا سرمایہ ہمیں واپس کیا گیا ہے اور ہم اپنے اہل کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ لائیں گے یہ غلہ (جو ہم لائے ہیں) تھوڑا ہے۔ (1561)

گرمی کے سفروں میں۔''

غلہ کی قیمت واپس کرنے کی غرض یہ تھی کہ وہ لوٹ کر آئیں یہ مراد ہوسکتی ہے کہ اتنے بڑے احسان کو دیکھ کر وہ پھر غلہ کے لیے اسی طرف رخ کریں گے اور یہ بھی کہ شاید اس روپے کو واپس کرنے کے لیے آئیں۔

1559- ﴿نَكْتَلْ﴾۔ اصل نَكْتَيِلْ ہے یعنی باب افتعال ہے یا الف سے بدل گئی جو بوجہ التقائے ساکنین گرادیا گیا۔

1560- مطلب یہ کہ تم پر اعتبار کروں تو ویسا ہی اعتبار ہوگا جیسا یوسف کے معاملہ میں کیا تھا۔ حفاظت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے یہی راستبازوں کا طریق ہے یوں ان سے سخت اقرار بھی لیا مگر پھر بھی بھروسہ ان پر نہیں بلکہ اللہ پر ہے۔ اسباب سے بھی کام لیتے ہیں مگر ان اسباب کو کامیابی کا مدار نہیں سمجھتے۔ هَلْ کے لیے [دیکھو نمبر: 269]۔

1561- ﴿نَمِيْرُ﴾۔ مِيْرَةٌ طعام کو کہتے ہیں اور [مَارَ يَمِيْرُ] غلہ لایا۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿٦٦﴾

اس نے کہا میں اسے ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک مجھے خدا کا عہد نہ دو کہ تم اسے ضرور میرے پاس لے آؤ گے۔ سوائے اس کے کہ تم سب ہی گھیر لیے جاؤ۔ پس جب انہوں نے اپنا عہد اسے دے دیا اس نے کہا جو ہم کہتے ہیں اللہ ہی اس کا ذمہ دار ہے۔ (1562)

وَ قَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَ مَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَ عَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٦٧﴾

اور اس نے کہا اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا اور الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا اور اللہ کے مقابل پر میں تمہارے کچھ بھی کام نہیں آ سکتا۔ حکم صرف اللہ کا ہے اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی پر چاہیے کہ سب بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں۔ (1563)

﴿يَّسِيْرٌ﴾۔ يُسْرٌ ضد عُسْرٌ ہے اور يَسِيْرٌ سہل کو کہتے ہیں مگر تھوڑی چیز کو بھی يَسِيْرٌ کہا جاتا ہے۔ (غ) یہاں یہی مراد ہے کہ جو غلہ ہم پہلے لائے ہیں وہ تھوڑا ہے یا قحط کے ایام کے لیے وہ مکتفی نہیں ہو سکتا۔

1562 - باوجود عہد موکد لے لینے کے آخر پر پھر معاملہ کو سپرد خدا ہی کیا ہے۔ وکیل اصل میں تو وہ ہے جس کے سپرد کوئی معاملہ کیا جائے اور چونکہ جس کے سپرد کوئی معاملہ کیا جاتا ہے وہ اس پر نگہبان بھی ہوتا ہے اس لیے نگہبان کے معنی کیے گئے ہیں۔ یوں بھی ترجمہ ہو سکتا ہے کہ اللہ ہی ہے جس کے سپرد یہ معاملہ کیا جاتا ہے۔ ﴿يُّحَاطَ بِكُمْ﴾ سے مراد گھیرے جانا بھی ہو سکتا ہے اور ہلاک ہونا بھی۔ کیونکہ جسے دشمن گھیر لے وہ ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔

1563 - **الگ الگ دروازوں سے داخل ہونے کی نصیحت کی غرض:** مفسرین کا زیادہ رجحان اسی طرف ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو نظر لگنے کے خوف سے یہ کہا تھا۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ جب وہ گئے تو یوسف نے ان سے سختی کی اور کہا تھا کہ تم جاسوس ہو [پیدائش: 9:42]۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خیال کیا ہو کہ اکٹھے داخل ہوں تو پھر حکومت مصر کو شبہات نہ گزریں اور ایسا نہ ہو کہ بادشاہ تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ اس شبہ میں گرفتار ہو جائیں اور یوں بادشاہ کی مہربانی بھی کچھ کام نہ آئے۔ اس لیے انہوں نے داخلہ کے وقت احتیاط کا پہلو اختیار کرنے کی تاکید کی اور اس کی تائید دو اور باتوں سے ہوتی

وَ لَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور جب وہ داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے حکم دیا تھا وہ اللہ کے مقابل پر ان کے کچھ بھی کام نہ آ سکتا تھا، ہاں یعقوب کے دل میں ایک حاجت تھی جسے اس نے پورا کیا اور بلاشبہ وہ علم والا تھا۔ اس لیے کہ ہم نے اسے علم دیا تھا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

ہے۔ اول یہ کہ جب ان سے اقرار لیا تو وہاں بھی ایک استثنا کیا تھا یعنی فرمایا تھا ﴿اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ﴾ سوائے اس کے کہ تم سب گرفتار ہو جاؤ۔ اور دوسرے اس سے کہ ساتھ ہی فرمایا ﴿مَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ﴾ اگر اللہ کی طرف سے ضرور کوئی مصیبت تم پر آنے والی ہے تو اس کا علاج میں نہیں کر سکتا۔ اور اگلی آیت میں اسی بات کا ذکر کر کے فرمایا ﴿اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ﴾ یعنی اسے کچھ علم بھی تھا جو ہم نے دیا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ **حضرت یعقوب علیہ السلام کو کسی وحی یا رؤیا کے ذریعہ سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان پر اس دفعہ کچھ مصیبت آنے والی ہے**۔ لیکن چونکہ پیشگوئی میں تفصیلات سے اطلاع نہیں دی جاتی عموماً اجمالی رنگ میں ایک واقعہ دکھایا جاتا ہے۔ اس لیے آپ کا خیال اس طرف گیا کہ پہلی مرتبہ جو ان پر جاسوسی کا شک ہوا شاید اسی وجہ سے بلا میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مگر چونکہ یہ خیال محض اجتہاد پر مبنی تھا اس لیے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اللہ کی طرف سے جو مصیبت آنے والی ہے اسے تو میں دور نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اگلی آیت میں پھر جب ان کے داخلہ کا ذکر کیا کہ وہ عافیت سے شہر میں تو داخل ہو گئے تو ساتھ ہی پھر بڑھایا کہ جو مصیبت آنے والی تھی وہ اس طرح پر دور نہ ہو سکی۔ کیونکہ وہ مصیبت جیسا آگے ذکر آتا ہے اور راہ سے آنے والی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں بھی مصیبت کا کچھ نقشہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو دکھا دیا گیا تھا اس لیے انہوں نے فرمایا تھا ﴿وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ﴾[13] پیشگوئیوں میں عموماً تعین واقعات کا نہیں ہوتا۔

رہا نظر کا لگنا، سو خوبصورتی کی وجہ سے جیسے نظر ایک ایک کو لگ سکتی ہے ویسے ہی بہتوں کو بھی لگ سکتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر نظر کی احتیاط کی وجہ سے ہوتا تو پہلی مرتبہ کیوں ایسی ہدایت نہ کرتے۔ دس اور گیارہ میں تو ایسا فرق نہیں ہو جاتا۔ واقعات اسی کے مؤید ہیں کہ پہلی مرتبہ انہیں ان پر کسی تکلیف کا آنا نہیں دکھایا گیا دوسری مرتبہ دکھایا گیا۔ اس لیے جو کچھ ان کی سمجھ میں آیا اس کے مطابق نصیحت کر دی۔ مگر پھر بھی صادق راستبازوں کی طرح اس احتیاط پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ بھروسہ تو اللہ پر ہی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ **صلحا توکل کے یہ معنی نہیں سمجھتے کہ اسباب سے کام نہ لیا جائے**۔ یہ بھی یہاں بڑھا دینا ضروری ہے کہ نظر کے لگنے کا ذکر احادیث میں ہے اور **نظر لگنا حق ہے**۔ بلکہ آج تو جن لوگوں نے مسمریزم کے ادنیٰ کرشموں کو دیکھا ہے وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ نظر بھی کیا کیا عجائبات دکھا سکتی ہے اور کس طرح پر نظر کے ذریعہ سے معمول پر اس قدر اثر ڈالا جا سکتا ہے کہ وہ عامل کے ہاتھ میں مردہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر دلیل ہے کہ کس طرح ہر قسم کے توہمات

وَ لَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور جب وہ یوسف کے پاس آئے اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا میں تیرا بھائی ہوں، سو اس پر افسوس نہ کر جو یہ کرتے رہے ہیں۔ (1564)

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾

پھر جب ان کا سامان دے کر تیار کر دیا (ایک نے) پانی پینے کا پیالہ اس کے بھائی کی بوری میں رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکارا، اے قافلے والو! تم تو چور ہو۔ (1565)

کو دور کرتے ہوئے ایک بات کو جس کی اصل انسان میں موجود تھی بلا خوف لومۃ لائم بیان کر دیا۔

1564 - یعنی اپنے بھائی کو خصوصیت سے اپنے پاس جگہ دی اور اسے علیحدگی میں بتایا کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ اس لیے جو کچھ انہوں نے کہا اس پر غم نہ کر۔ یعنی جو معاملہ میرے ساتھ کیا، اس پر اب کوئی افسوس نہ کر۔

1565 - سِقَايَةَ۔ سَقٰی اور اَسْقٰی کے معنی ہیں پینے کو دیا اور اَسْقَآءٌ۔ سَقٰی سے زیادہ بلیغ ہے یعنی اَسْقَآءٌ یہ ہے کہ اس کے لیے پینے کی چیز ٹھہرا دے یہاں تک کہ وہ اسے خود لے کر جس طرح چاہے پیئے۔ ﴿سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ [الدھر: 21:76] ''ان کا رب انہیں پاک کرنے والی پینے کی چیز پلائے گا۔'' ﴿وَّ اَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا﴾ [المرسلات: 27:77] ''اور تمہیں میٹھا پانی پلایا۔'' ﴿نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا﴾ [المؤمنون: 21:23] ''ہم تمہیں اس سے پلاتے ہیں جو ان کے پیٹوں میں ہے۔'' اور سَقَايَةٌ وہ ہے جس میں پینے کی چیز ڈالی جائے یعنی گلاس یا پیالہ جس میں پانی پیا جائے اور آگے اسی کو صُوَاعٌ کہا ہے اور صَاعٌ ماپنے کا پیمانہ ہوتا ہے۔ پس اسی کو صُوَاعٌ اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہی ماپ کا بھی پیمانہ تھا۔ (غ)

عِيْرُ اس جماعت کو کہا جاتا ہے جن کے ساتھ غلہ کے بوجھ ہوں یعنی آدمیوں پر اور اونٹوں پر جن پر بوجھ لدے ہوئے ہوں، یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ گو اس کا استعمال الگ الگ دونوں پر بھی ہوتا ہے۔

بن یامین کی بوری میں پیالہ رکھنے والے حضرت یوسفؑ نہ تھے:

﴿جَعَلَ السِّقَايَةَ﴾ میں ضمیر کس طرف جاتی ہے؟ مفسرین کا خیال یوسف کی طرف ہے۔ گویا حضرت یوسف علیہ السلام نے خود بوری کے اندر پیالہ رکھا۔ مگر اس پر قرآن شریف کے الفاظ کئی قسم کی مشکلات وارد کرتے ہیں۔ خود ایسی کارروائی کر کے پھر سب لوگوں میں یہ اعلان کرانا کہ قافلہ والے چور ہیں ﴿اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ﴾ ایک نبی کے کس طرح شایان شان ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک معمولی آدمی بھی کرے تو قابل گرفت ہے۔ قرآن شریف میں ہے ﴿وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ

قَالُوْا وَ اَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ انہوں نے کہا اور وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے، تم کیا نہیں پاتے؟(1566)

بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ [النسآء: 112:4] ایک شخص خود ایک گناہ کرے پھر اس کا الزام دوسرے پر لگائے تو وہ ارتکاب بہتان کرتا ہے۔ مفسرین اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ان کو سارق اس لحاظ سے کہا کہ انہوں نے خود یوسف کو اپنے باپ سے چرایا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو الزام اہل مصر کے سامنے اعلان ہوا وہ تو یہ تھا کہ تم نے پیالہ چرایا ہے اور اس کے وہ مرتکب نہ تھے۔ اور آخر کار انہی میں سے ایک کی بوری سے اسے نکال کر اہل مصر کی نظر میں انہیں چور ٹھہرا بھی دیا۔ پس قرآن کریم کا منشا ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خود وہ پیالہ بوری میں رکھا یا رکھوایا۔ اس سے پہلے جب روپیہ ان کو واپس کیا گیا تو یہ لفظ ہیں کہ اپنے نوکروں کو کہا کہ ان کا روپیہ ان کی بوریوں میں رکھ دو۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ بوریوں کا بھرنا بھرانا حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنا کام نہ تھا اور نہ وہ کام آپ کے سامنے ہوتا تھا۔ اس لیے اگر پیالہ حضرت یوسف علیہ السلام نے رکھوانا ہوتا تو اسی طرح اپنے نوکروں کو حکم دیتے جس طرح روپیہ رکھنے کے لیے دیا تھا۔ اس لیے اس کا رکھنے والا کوئی اور تھا۔ قرآن شریف سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھائیوں نے ایک بھاری شرارت کی تھی اسی طرح بن یامین کے ساتھ بھی کی۔ چنانچہ جب حضرت یوسف علیہ السلام اپنے آپ کو ان پر ظاہر کرتے ہیں تو یوں فرماتے ہیں ﴿هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ﴾ [89] اب ظاہر ہے کہ اور کوئی واقعہ بن یامین کے ساتھ ایسا نہیں ہوا جس میں ان کے ساتھ قریباً قریباً ویسا ہی سلوک ہوا جیسا یوسف کے ساتھ ہوا۔ صرف یہی ایک واقعہ ہے اور ان کی شرارت کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے چوری کا جھوٹا الزام یوسف پر بھی لگایا ﴿قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ﴾ [77] اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے بھائی یوسف نے بھی چوری کی تھی۔ حالانکہ یہ دونوں جھوٹ تھے۔ گویا بجائے صفائی کی شہادت پیش کرنے کے اور چوری کے الزام کی تائید کا مطلب یہ کہ یہ دونوں بھائی چور ہیں۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب انہوں نے جا کر یہ ذکر کیا کہ تیرے بیٹے نے چوری کی ہے تو انہوں نے اس کا الزام انہی پر دیا ﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا﴾ [83] جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ تمہاری ہی کوئی شرارت ہے۔ پس اصل واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان بھائیوں میں سے کسی نے محض شرارت کے طور پر پیالہ اٹھا کر بن یامین کی بوری میں رکھ دیا تا کہ یوسف کی طرح وہ بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظروں سے دور ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ بائبل میں یہی ذکر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے نوکروں کو پیالہ رکھنے کا حکم دیا تھا مگر بائبل نے قبیح ترین افعال انبیاء کی طرف منسوب کیے ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام کی طرف زنا وہ بھی بیٹیوں کے ساتھ، حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف شرک، حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف بت پرستی، حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف زنا۔ اور قرآن کریم نے ایسے تمام ناپاک الزامات سے انبیاء علیہم السلام کی بریت کی ہے اور عصمت انبیاء کا اصول سکھایا ہے۔ اس لیے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف ایسا فعل اگر بائبل منسوب کر دے تو اس کی معمولی تحریفات میں سے ایک ہے مگر قرآن کریم ایسا نہیں کرسکتا۔

1566 - ﴿اَقْبَلُوْا﴾۔ اِقْبَالٌ کے معنی متوجہ ہونا ہیں۔ ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [الصافات: 50:37] ''سو وہ ایک دوسرے کی طرف

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾

انہوں نے کہا ہم بادشاہ کا پیالہ نہیں پاتے اور جو شخص اسے لائے اس کے لیے ایک اونٹ کا بوجھ (انعام) ہوگا اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ (1567)

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾

انہوں نے کہا اللہ کی قسم تم جانتے ہو ہم اس لیے نہیں آئے کہ ملک میں فساد کریں اور ہم چور نہیں ہیں۔ (1568)

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾

انہوں نے کہا پھر اس کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے نکلے۔

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

انہوں نے کہا اس کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کی بوری میں وہ نکلے وہی اس کا بدلہ ہوگا، ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔ (1569)

منہ کریں گے۔''

1567 - ﴿زَعِيْمٌ﴾۔ زَعَمَ کے لیے [دیکھو نمبر: 679]۔ ضمانت جو قول سے ہو اور ریاست کو زَعَامَة کہا جاتا ہے اور ضامن اور رئیس کو زَعِيْمٌ کہا جاتا ہے اس لیے کہ ان دونوں کے قول میں جھوٹ کا ظن ہوتا ہے۔ (غ)

﴿صُوَاعَ الْمَلِكِ﴾ کا لفظ خود ظاہر کرتا ہے کہ جو چیز گم ہوئی وہ یوسف کا پیالہ نہ تھا بلکہ شاہی پیالہ تھا۔ اس لیے بھی اس کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام سے نہیں۔ قرین قیاس ہے کہ یہ سونے کا ہو، اس لیے اس پر اتنی تحقیقات بھی ہوئی۔

1568 - ﴿تَاللّٰهِ﴾۔ تا کلمہ کے شروع میں قسم کے لیے آتی ہے۔ (غ) اور اکثر نحویوں کے نزدیک یہ واؤ کا بدل ہے۔ مگر سوائے اللہ کے لفظ کے دوسرے پر نہیں آتی۔ (ر)

1569 - ﴿جَزَآؤُهٗ﴾ میں ضمیر فعل کی طرف ہے جیسا پچھلی آیت میں یعنی چوری کی سزا یہ ہے ﴿فَهُوَ جَزَآؤُهٗ﴾ یعنی وہ خود اس کے عوض گرفتار کیا جائے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ پہلے یہ دریافت کرتے ہیں کہ تمہارا گم کیا ہوا ہے۔ تو جب یہ علم ہو جاتا ہے کہ یہ پیالہ کے لیے ہی آئے ہیں تب سزا یہ بتاتے ہیں کہ جس کی بوری میں ہو وہ پکڑا جائے، کیونکہ جانتے تھے کہ بن یامین کی بوری میں ہے۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾

تب اس نے ان کے بھائی کے شلیتے سے پہلے ان کے شلیتوں سے شروع کیا تب اس کے بھائی کے شلیتے سے اسے نکالا۔ اسی طرح ہم نے یوسف کے لیے ارادہ کیا کہ وہ اپنے بھائی کو شاہی قانون کے مطابق نہ لے سکتا تھا، سوائے اس کے جو اللہ چاہے، ہم جس کو چاہتے ہیں درجے بلند کرتے ہیں اور ہر ایک علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے۔ (1570)

1570 - اَوْعِيَةِ۔ وِعَاءٍ کی جمع ہے اور وَعِیَ کے معنی ہیں کسی بات کا یاد رکھنا ﴿وَّ تَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ﴾ [الحاقة: 12:69] ''اور یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔'' اور اِیْعَاءٌ کے معنی ہیں سامان کا وِعَاء میں محفوظ کر لینا ﴿جَمَعَ فَاَوْعٰى﴾ [المعارج: 18:70] ''جمع کرتا ہے اور بند رکھتا ہے۔'' اور وِعَاءٌ وہ برتن ہے جس میں کوئی چیز محفوظ کی جائے۔

كِدْنَا۔ كَادَ بمعنی ارادہ کے لیے [دیکھو نمبر: 97] یہاں یہی معنی ہیں۔

دِيْنِ۔ کے معنی شریعت [دیکھو نمبر: 3]۔ اسی لحاظ سے یہاں قانون کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ قتادہ سے حکم اور قضا معنی مروی ہیں۔

بنیامین کا حضرت یوسفؑ کے پاس رہ جانا:

جن واقعات کا ذکر ہے ان سے یہ نہیں پایا جاتا کہ یہ سب کچھ حضرت یوسف علیہ السلام کی موجودگی میں ہو رہا ہے۔ بلکہ بظاہر وہی شخص جو تحقیقات کے لیے آیا ہے سب کچھ یہ خود ہی کر رہا ہے اور بن یامین کی بوری کو پیچھے رکھنا اگر عمداً تھا تو شاید اس لیے ہو کہ بن یامین کی خصوصیت سے یوسف علیہ السلام کے ہاں عزت ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہمارا ارادہ یوسف کے لیے ایسا ہی ہوا کہ ان کا بھائی ان کے پاس رہ جائے۔ كِدْنَا بمعنی اَرَدْنَا ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ آگے آتا ہے ﴿اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت سے ایسا ہوا۔ اور اگر كِدْنَا بمعنی تدبیر بھی لیا جائے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تدبیر ہم نے یوسف کے لیے کی۔ یہ نہیں فرمایا کہ یوسف نے یہ تدبیر کی اور اس صورت میں كِدْنَا کے لفظ میں یہ اشارہ ہوگا کہ ان کے بھائیوں کی تدبیر تو یہ تھی کہ بن یامین کسی طرح واپس حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس نہ جائے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو یوسف کے حق میں کر دیا کہ بھائی بھائی کے پاس رہ گیا۔ وہ خود بغیر افشائے راز کے اسے رکھ نہ سکتے تھے۔ اور اس حقیقت کو وہ بھی ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے۔ مشیت الٰہی سے یہ ایک سامان پیدا ہو گیا کہ بن یامین حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس رہ گئے۔ گو وہ ذی علم تھے مگر یہ سامان اس خدا کی طرف سے ہو گیا جو ان سے بڑھ کر علیم تھا۔ اگر یوسف علیہ السلام نے خود یہ کام کیا ہوتا تو یہاں ﴿نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ﴾ کا کوئی موقعہ

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَ لَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾

انہوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی۔ سو یوسف نے اسے اپنے دل میں چھپایا اور اسے ان پر ظاہر نہ کیا۔ کہا تم بری حالت کے لوگ ہو اور اللہ بہتر جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو۔ (1571)

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

انہوں نے کہا اے عزیز اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے تو ہم میں سے ایک کو اس کی جگہ رکھ لے ہم تجھے نیکو کاروں میں سے دیکھتے ہیں۔

نہ تھا۔ کیونکہ بہرحال یہ ایک چالبازی تھی اور چالبازی کے موقعہ پر رفع درجات موزوں نہیں۔ ہاں خود بخود اس سامان کا پیدا ہوجانا رفع درجات پر گواہ ہے۔ یعنی جب انسان اللہ تعالیٰ کے لیے ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے فائدہ کے سامان خود بخود پیدا کر دیتا ہے۔

دوسرے دین کے بادشاہ کے قانون پر عمل:

اس آیت سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے مذہب کے بادشاہ کے ماتحت ہے تو اسی کے قانون پر عمل بھی کرنا پڑتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام ایک ایسے بادشاہ کے ماتحت تھے جو ان کے دین پر نہ تھا۔ بایں اس کے قانون پر ہی عمل کرتے تھے۔ اس چھوٹے سے واقعہ کے اظہار سے ایک عظیم الشان اصول قائم کر دیا ہے۔

1571- حضرت یوسف علیہ السلام پر جو چوری کا الزام انہوں نے لگایا ہے تو مفسرین اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یا تو بائبل کے بعض بیانات میں ادل بدل کرتے ہیں یا خود کوئی کہانی تجویز کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ الزام دینے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک بے گناہ کی جان تک لینے سے دریغ نہ کیا اور پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے جا کر جھوٹ بولا۔ اس لیے اگر اس دوسرے موقعہ پر بھی انہوں نے جھوٹ سے کام لیا تو یہ کون سا امر مستعبد ہے۔ بات تو صاف ہے وہ اپنے آپ کو تو الگ کرتے ہیں اور یوسف کے بھائی پر چوری کا الزام ثابت کرنے کے لیے تائیدی شہادت یہ دیتے ہیں کہ اس کا بھائی بھی چور تھا۔ کیونکہ ان کی غرض تو یہی تھی کہ کسی طرح بن یامین بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں سے دور ہوجائے۔ گویا ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو نیک لوگ ہیں یوسف اور اس کا بھائی دونوں چور ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے اپنے دل میں کس بات کو چھپایا؟ اس تہمت کے جواب کو ان پر ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے ورنہ یوں جواب دیتے کہ تم میرے منہ پر جھوٹا الزام لگاتے ہو۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

اس نے کہا اللہ کی پناہ کہ ہم کسی اور کو پکڑیں مگر جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا تو تو ہم ظالم ہوں گے۔ (1572)

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾

جب اس سے مایوس ہو گئے تو مشورہ کرنے کے لیے الگ ہو گئے۔ سب سے بڑے نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے تم سے اللہ کا عہد لیا تھا اور پہلے جو یوسف کے معاملہ میں تم قصور کر چکے ہو، سو میں ہرگز اس ملک کو نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ میرا باپ مجھے اجازت نہ دے۔ یا اللہ میرے لیے فیصلہ نہ کرے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ (1573)

1572 - ان بھائیوں میں سے بعض اچھے دل کے بھی تھے۔ ان میں سے ہی وہ بھی تھا جس نے پہلے موقعہ پر کہا تھا ﴿لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ﴾ اب بھی ان میں سے کوئی حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ بن یامین کی جگہ کسی دوسرے کو قید کر لیا جائے جس کو حضرت یوسف علیہ السلام ردّ کرتے ہیں۔

1573 - ﴿اسْتَيْـَٔسُوْا﴾۔ اِسْتَائِيَسُ اور يَئِسَ کے ایک ہی معنی ہیں امید منقطع ہو گئی۔ (غ) یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے انکار کر دیا۔

﴿نَجِيًّا﴾۔ نَجْوٰى کے لیے [دیکھو نمبر: 731]۔ نَجِی کے معنی ہیں مُنَاجِیْ یعنی خفیہ مشورہ کرنے والا اور واحد اور جمع دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا﴾ [مریم: 52:19] ''اور اسے مقرب بنایا۔''

اَبْرَحَ۔ بَرِحَ کے معنی زَالَ آتے ہیں ﴿لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ﴾ [طٰهٰ: 91:20] ''ہم اس کی عبادت میں لگے رہیں گے۔'' ﴿لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ﴾ [الکھف: 60:18] ''میں (چلنا) نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے اکٹھا ہونے کی جگہ پہنچ جاؤں۔'' اور [بَرِحَ الْاَرْضَ] کے معنی ہیں اس زمین سے الگ ہو گیا۔ (ل)

یہ مشورہ کرنے کے لیے الگ ہوئے کہ اب حضرت یعقوب علیہ السلام سے جا کر کیا کہیں۔ اس مشورہ کی ضرورت بھی نہ ہوتی اگر ان کے دل صاف ہوتے۔ اب چاہتے تھے کہ کوئی بات بنائیں جس پر حضرت یعقوب علیہ السلام کو اطمینان ہو جائے ان میں سب سے بڑا بوجہ اس عہد کے جو حضرت یعقوب علیہ السلام سے کیا تھا جانے سے ہی انکار کرتا ہے۔ جب تک کہ باپ کی طرف سے اجازت نہ ملے یا اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے یعنی کوئی ایسے اسباب پیدا ہو جائیں کہ عہد کی ذمہ داری اس پر نہ رہے۔

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾

اپنے باپ کی طرف واپس جاؤ اور کہو اے ہمارے باپ تیرے بیٹے نے چوری کی اور ہم وہی گواہی دیتے ہیں جو ہمیں معلوم ہے اور ہم غیب کے نگہبان نہ تھے۔ (1574)

وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور اس بستی سے دریافت کرو جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

اس نے کہا بلکہ تمہارے دلوں نے ایک (بری) بات کو اچھا کر دکھایا سو نیک صبر ہی ہے۔ امید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے۔ وہ علم والا حکمت والا ہے۔ (1575)

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰي يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ

اور ان سے منہ پھیر لیا اور کہا ہائے افسوس یوسف کی وجہ سے اور اس کی آنکھیں غم سے ڈبڈبا آئیں۔

1574 - یہ کلام اسی بڑے بھائی کا سمجھا گیا ہے مگر بعض نے کہا ہے کہ یہ یوسف کا کلام ہے۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ ان کے مشورے کا آخری نتیجہ ہے یعنی آخر کار سب اس رائے پر پہنچے کہ یوں ہی کہا جائے کہ بن یامین نے چوری کی اور غیب کے حافظ نہ ہونے سے یہ مراد ہے کہ جو کام ہماری آنکھوں کے اوجھل ہوا یعنی بن یامین کا چوری کرنا اس کی ہم حفاظت کیونکر کر سکتے تھے۔ یا مراد یہ ہے کہ جب عہد کیا تھا تو اس وقت اس غیب کی بات کا ہمیں علم نہ تھا کہ یہ چوری کرے گا۔

1575 - **بنیامین پر چوری کا الزام بھائیوں کا منصوبہ تھا:** درمیانی واقعات کو چھوڑ کر اب بتاتا ہے کہ جب اسی کے مطابق انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہا تو انہوں نے جواب میں وہی لفظ کہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ماجرا کے وقت کہے تھے ﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ﴾ جس سے معلوم ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس بات کو ان کی طرف منسوب کیا ہے کہ یہ بھی تم نے ایک منصوبہ بنایا ہے جس طرح یوسف کے معاملہ میں بنایا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ﴿سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ﴾ کہہ کر کہ تم نے اب بھی کوئی برا کام کیا ہے جو تمہیں اچھا معلوم ہوا کوئی جھوٹا الزام ان پر نہ دے سکتے تھے۔ بلکہ یہ بات ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معلوم ہو گئی تھی جس طرح یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دونوں واپس مل جائیں گے۔

فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾ پس وہ (غم کو) دبائے تھے۔(1576)

1576- ﴿ابْيَضَّتْ﴾۔ بَيَاضٌ کے معنی سفیدی ہیں اور اَبْيَضَ سفید [بَيَّضَ الشَّيْءَ فَابْيَضَ] یعنی بیض کے معنی سفید کر دیا اور اَبْيَضَ کے معنی وہ سفید ہوگئی اور [بَيَّضْتَ السَّقَاءُ] کے معنی ہیں مشکیزہ کو پانی سے بھر دیا۔(ل) اسی لحاظ سے اَبْيَضَ کے معنی ہوں گے وہ پانی سے بھر گیا اور پانی اور دودھ کو یا پانی اور روٹی کو یا پانی اور گیہوں کو اَبْيَضَانِ کہا جاتا ہے یعنی دو سفید چیزیں۔

حضرت یعقوبؑ کا غم میں رو رو کر اندھا ہو جانا خلاف قرآن ہے:

﴿ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ﴾ کے معنی مفسرین نے عموماً یوں کیے ہیں کہ غم کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام روتے رہتے تھے اور روتے رہنے سے ان کی آنکھیں جاتی رہیں یعنی وہ اندھے ہو گئے۔ گویا اَبْيَاضَ اندھا ہو جانے سے کنایہ ہے۔ لیکن یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک خدا کا نبی بیٹے کے جاتے رہنے سے تبلیغ و اصلاح کے کام کو چھوڑ کر جو اس کی بعثت کی اصل غرض ہے رونے لگ جائے اور یہاں تک روئے کہ روایات میں ہے کہ اسّی سال تک آپ یوسف سے جدا رہے اور اس سارے عرصہ میں ایک لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ آپ کے دل میں غم نہ ہو اور رخساروں پر آنسو نہ ہوں اور اسی حالت میں آپ روتے روتے اندھے ہو گئے۔ مخلوق کی اصلاح تو ایک طرف رہی ایسا شخص تو خدا تعالیٰ کی بھی عبادت نہیں کر سکتا۔ اگر ایک عامی آدمی اپنی کسی عزیز کی وفات پر ایک ماہ بھی روئے تو وہ ملامت کے قابل ہوگا۔ چہ جائیکہ خدا کا نبی اسّی سال تک اس حال میں رہے۔ پھر ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہا ہو ﴿فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے یقین بھی دلا دیا ہو کہ وہ بیٹا زندہ ہے۔ یہ بات کسی طرح قابل تسلیم نہیں۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ بھی اپنے بیٹے ابراہیم کی وفات پر روئے تھے اور فرمایا تھا: [اَلْقَلْبُ يَحْزَنُ، وَالعَيْنُ تَدْمَعُ] (المستدرك على الصحيحين للحاكم، كتاب الجنائز، حديث:1410) دل میں غم ہے اور آنکھوں میں آنسو ہیں۔ مگر یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ آنحضرت ﷺ ایک دو سال روتے رہے تھے یا ایک دو ماہ ہی روتے رہے تھے۔ بلاشبہ عزیزوں کی جدائی پر آنکھوں میں آنسو بھر آنا تقاضائے فطرت ہے اور اگر حضرت یعقوب علیہ السلام میں اسی حد تک مانا جائے تو یہ بتقاضائے محبت پدری ہے۔ لیکن اسّی سال تک دن رات روتے چلے جانا یہاں تک کہ انسان اندھا ہو جائے اس کے برابر اہل دنیا کی بھی کوئی جزع فزع نہیں اور اس سے بڑھ کر بے صبری کوئی نہیں اور نبوت کا کام تو پھر گویا یوسف کی پرستش ہوئی نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔ [اَبْيَضَا عَيْنٌ] کے معنی لغت میں اندھا ہونا کہیں نہیں لکھے۔ ہاں یہ مراد سمجھی گئی ہے۔ مگر اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ آنکھوں میں آنسو بھر کر آنکھیں سفید ہو گئیں۔ جس کو ہماری زبان میں ڈبڈبانا کہتے ہیں اور یہ وہ امر ہے جو ایک نبی کی شان کے لائق ہے کہ جب آپ کو یہ خبر پہنچتی ہے کہ بن یامین پکڑے گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام کا صدمہ تازہ ہو کر آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ مگر بایں وہ اپنے رنج اور غم کو دباتے ہیں جیسا کہ لفظ كَظِيْمٌ لا کر ظاہر کیا گیا ہے جس کے معنی غصہ یا غم وغیرہ دبانے کے ہیں کہ وہ ظاہر نہ ہونے پائے، [دیکھو نمبر: 518]۔ جس کی آنکھوں سے اسّی سال تک آنسو خشک نہ ہوں اسے كَظِيْمٌ کس زبان میں کہا جائے گا؟

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

انہوں نے کہا اللہ کی قسم تو یوسف کا ذکر کرتا ہی رہے گا یہاں تک کہ تو مرنے کے قریب ہو جائے یا ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائے۔ (1577)

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

کہا میں اپنی پریشانی اور غم کی شکایت اللہ سے ہی کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ (1578)

یہ معنی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہیں۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے:[أَنَّهُ لَمَا قَالَ يَا أَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ غَلْبَهُ الْبَكَاءُ، وَعِنْدَ غَلْبَةِ الْبُكَاءِ يَكْثُرُ الْمَاءُ فِي الْعَيْنِ فَتُصِيْرُ الْعَيْنَ كَأَنَّهَا ابْيَضَّتْ مِنْ بَيَاضِ ذٰلِكَ الْمَاءُ ..... فَلَوْ حَمَلْنَا الْاَبْيَضَاضُ عَلٰى غَلْبَةِ الْبُكَاءِ كَانَ هٰذَا التَّعْلِيْلُ حَسَنًا وَلَوْ حَمَلْنَاهُ عَلَى الْعَمٰى لَمْ يُحْسَنَ هٰذَا التَّعْلِيْلِ، فَكَانَ مَا ذَكَرْنَاهُ أَوْلٰى وَهٰذَا لِلتَّفْسِيْرِ مَعَ الدَّلِيْلِ رَوَاهُ الْوَاحِدِيْ فِي الْبَسِيْطِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا] (تفسیر الرازی، باب84، جلد9، صفحہ 97) یعنی جب آپ نے یوسف پر اس وجہ سے افسوس کیا تو بکاء (رونا) آپ پر غالب آ گیا اور رونے کے غلبہ کے وقت آنکھ میں پانی بہت ہو جاتا ہے گویا اس پانی کی سفیدی سے وہ سفید ہو جاتی ہے۔۔۔۔ پس اگر ہم سفید ہو جانے کو غلبہ بکاء پر حمل کریں تو یہ وجہ اچھی ہے اور اگر اسے اندھا پن پر حمل کریں تو یہ وجہ اچھی نہیں۔ اس لیے جو ہم نے بیان کیا ہے وہ اولیٰ ہے۔ اور یہ تفسیر مع دلیل کے واحدی نے بسیط میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے۔

1577 - ﴿تَفْتَؤُا﴾۔ لَا تَفْتَتُؤُا مراد ہے اور مَا فَتِئْتُ کے معنی وہی ہیں جو مَا زِلْتُ کے معنی ہیں اور لَا کے محذوف ہونے پر یہ دلیل ہے کہ قسم کا جواب اگر مثبت ہو تو اس پر علامت اثبات ضرور داخل ہوتی ہے اور علامت اثبات ل اور نون تاکید ہے۔

یوسف کی اس یاد کو بھائیوں نے برا منایا کیونکہ ان کے دل انہیں ملزم کرتے تھے اس لیے وہ پسند نہ کرتے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اس کا نام بھی لیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب آپ بوڑھے ہو کر موت کے قریب ہو گئے ہیں تاہم یوسف کے ذکر کو نہیں چھوڑتے۔ اس سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام ہر وقت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ بلکہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مدت کے بعد یہ ذکر کیا جس کی وجہ سے بھائیوں کو یہ بات کہنے کی ضرورت پیش آئی۔

1578 - اس سے معلوم ہوا کہ اپنے رنج و مصائب کو دوسروں پر ظاہر کرنے سے حتی الوسع بچنا چاہیے اور صرف اپنے مولیٰ کے سامنے ظاہر کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہی غم و رنج کو دور بھی کر سکتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ [كُنُوزِ الْبِرِّ إِخْفَاءُ الصَّدَقَةِ وَكِتْمَانُ الْمَصَائِبِ] (شعب الایمان، جلد12، صفحہ377، حدیث:9577) صدقہ کا اخفا اور مصائب کا چھپانا نیکی کے خزانے

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا پتہ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو کیونکہ اللہ کی رحمت سے سوائے کافر لوگوں کے اور کوئی مایوس نہیں ہوتا۔ (1579)

ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کا روتے رہنا اس آیت کے بھی خلاف ہے۔

1579 - تَحَسَّسُوْا۔ حَسَّ سے باب تفاعل ہے حاسہ سے کسی چیز کا پالینا اور مراد اس سے اس کے احوال کا دریافت کرنا ہے۔

رَوْح وسعت پر بولا جاتا ہے اور یہاں مراد اس سے کشائش اور رحمت ہے۔ (غ) اسی مادہ سے رِیْح اور رُوْح ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی تاریخ کا یہ حصہ کہ بھائی دوبارہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس گئے اور بن یامین کی گرفتاری کا قصہ سنایا بائبل میں مذکور نہیں۔ بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے آپ کو اسی وقت ظاہر کر دیتے ہیں جب بن یامین کو پکڑا جاتا ہے اور بھائی حیران ہیں کہ اب کیا کریں۔ قرآن کریم نے اس حصہ کو بیان کر کے اور بائبل سے اس موقعہ پر اختلاف کر کے یہ دکھایا ہے کہ باوجود اسباب مایوسی کے انتہا کو پہنچ جانے کے، باوجود ایک صدمہ کے ساتھ دوسرا صدمہ اور مل جانے کے، **مایوسی حضرت یعقوب علیہ السلام کے قریب بھی نہیں آئی**۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ان تکالیف کے دور کرنے پر آپ کا ایمان بڑھتا ہی چلا گیا اور یہ وہ عظیم الشان سبق ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نیک لوگوں کی زندگیاں بیان کر کے سکھانا چاہتا ہے کہ وہ کس طرح پر مایوسی کے اسباب کے کمال کو پہنچ جانے کے باوجود ایک لمحہ کے لیے بھی مایوسی کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔ بلکہ جس قدر تاریکی بڑھتی ہے اسی قدر ان کا ایمان بڑھتا ہے کہ روشنی ضرور نمودار ہوگی۔ چنانچہ اس مضمون کو خود قرآن شریف نے سورت کی آخری آیات میں کھول دیا ہے۔ دیکھو [آیت: 110]۔ افسوس ہے کہ بائبل میں نہ تو اسباب مایوسی انتہا کو پہنچتے ہیں اور نہ ہی حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی میں وہ دلوں کو ابھارنے والا نظارہ نظر آتا ہے جو یہاں ان الفاظ میں قرآن کریم نے دکھایا ہے ﴿لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [87] یہ وہ ایک عظیم الشان سبق ہے جو اس سورت سے ہمیں ملتا ہے۔ مگر بائبل کے قصہ سے نہیں ملتا۔ بائبل میں یہ ایک کہانی ہے مگر قرآن کریم میں قدم قدم پر اس کے اندر وہ اخلاقی سبق بھر دیئے ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھائے تو اس کی زندگی اس دنیا میں جنت کی زندگی بن جاتی ہے۔

مسلمانوں کے مایوس دلوں کے لیے مرہم:

اور ایک مسلمان کے دل میں اس ذکر کو پڑھ کر یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر چاروں طرف مغلوبیت حق کا نظارہ ہی نظارہ نظر آتا ہو اور کفر اپنی ترقی کی انتہا کو پہنچ گیا ہو اور نیکوں کو پاؤں تلے روندا جاتا ہو اور مکار اور فریبی دنیا میں مالک نظر آتے ہوں اور سب چیزیں ان کے قبضہ قدرت میں معلوم ہوتی ہوں تو بھی وہ مایوس نہیں ہوتے اور اللہ کی رحمت کے آفتاب کے طلوع پر یقین رکھتے

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾

پھر جب اس کے پاس آئے کہا اے عزیز ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو تکلیف پہنچی ہے اور ہم تھوڑا سا سرمایہ لے کر آئے ہیں سو ہمیں (غلہ کا) پورا ماپ دے اور ہمیں خیرات دے اللہ خیرات دینے والوں کو (اچھا) بدلہ دیتا ہے۔ (1580)

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾

اس نے کہا کیا تم جانتے ہو تم نے یوسف اور اس کے بھائی سے کیا کیا؟ جب تم جاہل تھے۔ (1581)

ہیں اس لیے کہ حق کا غلبہ یقینی ہے۔ تعجب ان مسلمانوں پر ہے جو قرآن کریم میں ایسی آیات کے ہوتے ہوئے پھر کفار کی نقل کرتے اور ذرا ذرا مشکلات پیش آنے پر گھبرا ہی نہیں اٹھتے بلکہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ آج جب اسلام ہر طرف مغلوب نظر آتا ہے اس ایمان کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جب مسلمانوں میں یہ ایمان پیدا ہو جائے گا تو وہی اسلام کی شان و شوکت بھی وہ دوبارہ دیکھ لیں گے جس کی تڑپ ان کے دلوں میں ہے۔

1580 - ﴿مُّزْجٰىةٍ﴾۔ تَزْجِيَةٌ (زَجَا) کسی چیز کا دھکیلنا ہے تاکہ وہ آگے چلے جیسے ہوا کا بادل کو چلانا ﴿يُزْجِيْ سَحَابًا﴾ [النور: 43:24] ''بادل کو چلاتا ہے۔'' ﴿يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ﴾ [بنی إسرائیل: 66:17] ''تمہارے لیے کشتیاں چلاتا ہے۔'' پس جو چیز قلیل ہو گو یا کسی شمار میں نہیں اور رد کی جائے اسے مُزْجَاةٍ کہا جاتا ہے۔ (غ)

اس دفعہ بموجب ارشاد حضرت یعقوب علیہ السلام وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی تلاش میں آئے اور اپنی مفلسی اور غربت کی طرف توجہ دلانا اس لیے تھا کہ اگر یہی یوسف ہیں تو ان کا دل پگھلے اور وہ اصلیت کا اظہار کر دیں۔ چنانچہ یہی اثر اس کا ہوا۔

1581 - **بنیامین سے بھائیوں کی شرارت:** یہی ایک موقعہ ہے جس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے ان بھائیوں کا سلوک یاد دلایا ہے وہ بھی ملامت کے لیے نہیں بلکہ اس بات کے ظاہر کرنے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ گو تم نے میرے ساتھ ایسا سلوک کر کے پھر میرے بھائی سے بھی اس قسم کا سلوک کیا تاہم آج تم پر ان باتوں کے لیے کوئی ملامت نہیں ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ [92] یہی وجہ ہے کہ یہ نہیں بتایا کہ وہ معاملہ کیا تھا۔ صرف اتنا کہہ کر چھوڑ دیا کہ تم نے جو کچھ معاملہ ہم دونوں سے کیا اسے تم جانتے ہو۔ اس سے یہ یقینی طور پر معلوم ہوا کہ بن یامین کے ساتھ کوئی شرارت اسی رنگ کی ان بھائیوں کی طرف سے ہوئی تھی جیسے یوسف علیہ السلام کے ساتھ۔ اور قرآن کریم میں ایک ہی ایسے واقعہ کا ذکر ہے یعنی پیالہ کی چوری۔ بائبل میں بھی اور کوئی واقعہ مذکور نہیں جس سے معلوم ہوا کہ بن یامین کے ساتھ کوئی اس قسم کا سلوک ہوا تھا جس کا الزام

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَآ اَخِیْ ۫ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۹۰

انہوں نے کہا کیا تو ہی یوسف ہے؟ اس نے کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر احسان کیا ہے ہاں جو کوئی تقویٰ اور صبر کرتا ہے تو اللہ بھی نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (1582)

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ۝۹۱

انہوں نے کہا اللہ کی قسم اللہ نے تجھے ہم پر فوقیت دی ہے اور یقیناً ہم خطا کار تھے۔ (1583)

یہاں ان پر دیا گیا ہے۔

1582 - اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا ﴿قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا﴾ یعنی ان تمام واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب پر احسان کیا اور دکھ سے راحت پیدا کر دی۔ اس بات سے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس کے فضل کی طرف کہ بظاہر انسان پر دکھ بھی آتے ہیں تو کس طرح وہ اپنے فضل سے انہیں راحت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر ایک راحت دکھ سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ جب تک انسان تکلیفوں میں مبتلا نہ ہو کبھی حقیقی راحت کو نہیں پا سکتا۔ اس لیے مصائب کو خوش دلی سے برداشت کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ان میں بھی انسان کی بہتری ہے۔ اس لیے اس کے بعد فرمایا جو کوئی بھی تقویٰ اور صبر کرے تو اللہ تعالیٰ محسنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا یعنی مصائب میں رعایت حقوق کو اور صبر کو ہاتھ سے نہ دے۔ اور ان الفاظ میں عام قانون کو بیان کرنے کا یہی منشا ہے کہ یہ یوسف علیہ السلام سے خاص معاملہ نہیں بلکہ جو انسان مصائب کی کٹھالی میں پڑتا اور صبر کرتا ہے اور تقویٰ کو ہاتھ سے نہیں دیتا وہی سونا بنا کر نکالا جاتا ہے۔

1583 - اٰثَرَ۔ اَثَرٌ کسی چیز کا اس بات کا حصول ہے جو اس کے وجود پر دلالت کرے اور اس کی جمع اٰثَارٌ ہے ﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا﴾ [الحدید: 27:57] ''پھر ہم نے ان کے قدموں پر ان کے پیچھے (اور) رسول بھیجے۔'' ﴿وَ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ﴾ [المؤمن: 21:40] ''اور زمین میں نشانات۔'' ﴿فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ﴾ [الروم: 50:30] ''سو اللہ کی رحمت کے آثار کی طرف دیکھ۔'' اور اس لیے اٰثَارٌ پہلے لوگوں کے نقش قدم کو بھی کہتے ہیں یعنی ایسا راستہ جو ان لوگوں کی طرف لے جاتا ہے جو پہلے گزر چکے ﴿فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ۝﴾ [الصافات: 70:37] ''اور وہ اسی (قدموں کے) نقشوں پر دوڑے چلے جاتے ہیں۔'' ﴿هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ﴾ [طٰہٰ: 84:20] ''وہ بھی میرے نقش قدم پر ہیں۔'' اور [اَثَرَتُ الْعِلْمَ] کے معنی ہیں میں نے علم کی روایت کی ﴿اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ﴾ [الأحقاف: 4:46] ''یا علم کا کوئی نشان (لاؤ)۔'' گویا وہ چیز ہے جو لکھی جائے یا روایت کی جائے تو اس کا اثر باقی رہ جائے اور استعارۃً اَثَرَ کے معنی بزرگی لیے جاتے ہیں اور اسی سے ایثار ہے جس کے معنی فضیلت دینا

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

کہا آج تم پر کچھ الزام نہیں اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ (1584)

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ

یہ میری قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے سامنے ڈال دو تا وہ یقین کر کے آ جائے

ہیں جیسے یہاں۔ اور ﴿يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ﴾ [الحشر: 9:59] ''وہ اپنے آپ پر (انہیں) مقدم رکھتے ہیں۔'' ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۖ﴾ [الأعلیٰ: 16:87] ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔'' (غ) یعنی ترجیح دیتے ہیں۔

1584 - ﴿تَثْرِيْبَ﴾۔ [ثَرَّبَ عَلَيْهِ] کے معنی ہیں اسے ملامت کی اور اس کے قصور پر اسے عیب لگایا اور اسے وہ یاد دلایا۔ اور یَثْرِب مدینہ طیبہ کا پہلا نام ہے اور نبی کریم ﷺ نے یثرب کی بجائے اس کا نام طیبۃ رکھا۔ کیونکہ ثَرب کلام عرب میں فساد کو کہتے ہیں۔ (ل) قرآن شریف میں ایک موقعہ پر صرف دوسروں کا قول نقل کرتے ہوئے اسے یثرب کے نام سے پکارا ہے ﴿يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ﴾ [الأحزاب: 13:33] ''اے یثرب کے رہنے والو! تمہارے لیے یہاں ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔''

عفو یوسفؑ اور عفو خاتم النبیین ﷺ:

کتنا بڑا دل ہے اور کتنا بڑا عفو ہے کہ وہ لوگ جو جان لینے کے درپے تھے انہیں یہ کہا کہ آج تم پر اس کی وجہ سے کوئی ملامت بھی نہیں۔ مگر اس مقام سے کس قدر بلند وہ مقام ہے جس کی طرف یوسف علیہ السلام کے ذکر میں اشارہ ہے یعنی آنحضرت ﷺ کا مقام جن کی جان لینے کی ایک دفعہ نہیں متعدد مرتبہ کوشش کی گئی اور آپ کو تیرہ سال کے عرصہ میں مکہ میں بڑے بڑے دکھ پہنچائے گئے۔ اور نہ صرف آپ کو بلکہ ہر اس شخص کو جو آپ کا دم بھرتا حد درجے کے دکھ دیئے جاتے۔ بعض کو جان سے مارا گیا اور یہ دکھ اس قدر شدت میں بڑھے کہ ان لوگوں نے اپنے وطن مالوف کو چھوڑ کر خود جلاوطنی اختیار کی۔ پھر یہ تیرہ سال کے مسلسل دکھ بھی مکہ کو چھوڑنے پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اب تلوار لے کر مدینہ پر چڑھائی کی جاتی ہے اور مٹھی بھر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بایں ان سب جرموں کے مرتکب جب مغلوب ہو کر آپ کے سامنے آتے ہیں تو یہی لفظ آپ کی زبان مبارک سے نکلتے ہیں ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ اور سید البشر کے عفو عظیم کا یہ نمونہ دنیا میں ہمیشہ کے لیے اپنی نظر آپ ہی رہتا ہے۔ اخلاقِ یوسفی میں اگر ﴿لَا تَثْرِيْبَ﴾ ایک عظیم الشان مقام ہے جس کا اثر دس بھائیوں تک محدود تھا تو اخلاق محمدی کے علو شان کو کون پہنچ سکتا ہے جو ایک مجرم قوم کی قوم کو جن کے جرم انتہا کو پہنچ چکے تھے اسی ﴿لَا تَثْرِيْبَ﴾ کے ماتحت ایسا بخشتا ہے کہ ایک حرف ملامت زبان پر نہیں لاتا۔

وَ اْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝٩٣
اور اپنا سب کنبہ میرے پاس لے آ ؤ۔(1585)

وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ۝٩٤
اور جب قافلہ (مصر سے) چلا ان کے باپ نے کہا میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں اگر مجھے بہکا ہوا نہ سمجھو۔(1586)

1585 - بَصِیْر۔ بَصَر قوت مدرکہ اور دیکھنے کی قوت دونوں کو کہا جاتا ہے [نمبر: 121] اور [رَجُلٌ بَصِیْرٌ] کے معنی ہیں مُبْصِرٌ اور بعض نے کہا اس سے مراد آنکھوں سے دیکھنے والا ہے۔ (ل) اور راغب یہ کہہ کر کہ ضَرِیْرٌ یعنی اندھے کو عکس کے طور پر بَصِیْرٌ کہا جاتا ہے لکھتے ہیں کہ قابل ترجیح یہ ہے کہ یہ اسے کہا جائے جس کے لیے بصیرت قلب کی قوت ہو۔ (غ) بہرحال بَصِیْرٌ کا لفظ اپنے اصل معنی کے لحاظ سے دونوں معنی دیتا ہے۔ آنکھ سے دیکھنے والا اور دل کی قوت مدرکہ سے ایک بات کو پا لینے والا۔

یہاں اس سورت میں قمیص کا ذکر تیسری دفعہ آیا ہے [دیکھو نمبر: 1525]۔ پہلی دفعہ قمیص حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا نشان ٹھہری، دوسری مرتبہ آپ کی پاکدامنی کا نشان ہوئی اور یہ قمیص **آپ کی حکومت کا نشان ہوئی**۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کو فرمایا [اِنَّ اللّٰهَ سَيُقَمِّصُكَ قَمِيْصًا وَاِنَّكَ سَتُلَاصُ عَلَى خَلْعِهٖ فَاِيَّاكَ فَلَا تَخْلَعْهُ] (الفائق فی غریب الحدیث والاثر، جلد3، صفحہ224) اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائے گا اور تمہیں اس قمیص کے اتارنے کو کہا جائے گا مگر خبردار اس قمیص کو نہ اتارنا۔ ابن اثیر کہتے ہیں کہ اس سے مراد خلافت ہے۔ پس ہوسکتا ہے کہ وہ قمیص اصلی تھی اور صرف بطور نشان حکومت بھیجی گئی تھی جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ یعنی تا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو یقین آجائے کہ جو کچھ ان کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی حکومت اور اختیارات کے متعلق کہا ہے وہ سچ ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ قمیص سے مراد یہاں واقعی حکومت ہی ہو اور قمیص کو لے جانے کے معنی یہ ہوں کہ یہ خبر لے جاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکومت عطا فرمائی ہے۔ بائبل میں یہ ذکر نہیں کہ قمیص بھیجی گئی تھی۔ صرف اسی قدر ذکر ہے کہ ان کو کہا تھا کہ میرے باپ کو خبر سنادو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہاں حکومت دی ہے اور وہاں یہ بھی ذکر ہے کہ جب بھائیوں نے یہ باتیں حضرت یعقوب علیہ السلام کو سنائیں ''تو یعقوب کا دل سنسنا گیا کیونکہ اس نے ان کا یقین نہ کیا۔'' شاید اسی کے ازالہ کے لیے ﴿یَاْتِ بَصِیْرًا﴾ اور ﴿فَارْتَدَّ بَصِیْرًا﴾ [96] فرمایا یعنی اسے یقین ہوگیا۔ مفسرین نے ایک توجیہہ اس کی یہ کی ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ خبر پہنچے گی تو اس سے ان کے دل کو قوت ملے گی اور قویٰ میں جو ضعف آ گیا ہے وہ دور ہوجائے گا اور بصارت کی بھی کمی دور ہوجائے گی۔ (ر) گویا اس صورت میں بھی انہوں نے اندھا پن سے اچھا ہونا مراد نہیں لیا اور نہ یعقوب کو اندھا مانا ہے بلکہ غم سے بصارت میں کچھ کمی مراد لی ہے جو اس خبر سے دور ہوجائے گی اور یقین کے معنی اس لیے بھی درست ہیں کہ گویا وحی الٰہی کے اشارات سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ علم تھا کہ یوسف زندہ ہیں اور واقعات کی شہادت سے وہ بات اب یقین کامل کی حد تک پہنچ گئی۔

1586 - رِیْحٌ کے مشہور معنی ہوا ہیں اور خوشبو اور بدبو کو بھی رِیْحٌ یا رَائِحَةٌ کہا جاتا ہے۔ [وَقَدْ يَكُوْنُ الرِّيْحُ بِمَعْنَى الْغَلَبَةِ

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾

انہوں نے کہا اللہ کی قسم تو اپنی پرانی غلطی میں ہے۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

پھر جب خوش خبری دینے والا آ پہنچا (اور) اسے اس کے سامنے پیش کیا تو وہ یقین کرنے والا ہوا۔ کہا کیا میں تمہیں نہیں کہتا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۷﴾

انہوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہمارے لیے ہمارے قصوروں کی معافی مانگ ہم قصوروار ہیں۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾

کہا میں اپنے رب سے تمہارے لیے بخشش مانگوں گا وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾

پھر جب وہ یوسف کے پاس آئے، اس نے اپنے والدین کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں خدا چاہے تو امن سے داخل ہو جاؤ۔

وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ

اور اس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا اور وہ اس کی خاطر سجدہ میں گر گئے اور اس نے کہا اے میرے باپ!

وَالْقُوَّةِ] (غ) یعنی رِیح کے معنی غلبہ اور قوت بھی آتے ہیں۔

﴿تُفَنِّدُوْنِ﴾۔ فَنَدٌ رائے کی کمزوری ہے اور تَفْنِیْدٌ دوسرے کی طرف اس کا منسوب کرنا۔ (غ)

یوسف کی ریح سے مراد یا تو یہ کہ مجھے خوشبو آ رہی ہے کہ یوسف زندہ ہے اور یا مراد یہ ہے کہ اس کی قوت و شوکت کی خوشبو آ رہی ہے۔ ادھر حضرت یوسف علیہ السلام اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں اور ادھر بفحوائے مفہوم دل را بدل رہ است حضرت یعقوب علیہ السلام کو علم ہو جاتا ہے۔

رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۱۰۰

یہ میرے پہلے خواب کی تعبیر ہے۔ میرے رب نے اسے سچ کر دیا اور اس نے مجھ پر احسان کیا، جب مجھے قید خانہ سے نکالا اور تمہیں بادیہ سے لے آیا اس کے بعد کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوا دیا تھا، میرا رب جو بات چاہے اسے باریک تدبیر سے کرتا ہے۔ وہ علم والا حکمت والا ہے۔ (1587)

1587 - الْعَرْش۔ بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ کو بوجہ اس کے علو کے عرش کہا جاتا ہے۔ جیسے یہاں ﴿اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا﴾ [النمل: 38:27] ''تم میں سے کون میرے پاس اس کا تخت لائے گا۔''

﴿خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾ خَرّ کے معنی ہیں اس طرح گرا کہ اس سے خَرِيْرٌ سنی گئی اور خَرِيْرٌ پانی یا ہوا وغیرہ کی اس آواز کو کہا جاتا ہے جو اوپر سے نیچے گرے ﴿فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ﴾ [الحج: 31:22] ''تو گویا وہ بلندی سے گر پڑا۔'' ﴿فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ﴾ [النحل: 26:16] ''سو چھت ان پر آ گری۔'' دوسری جگہ ہے ﴿خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ [السجدة: 15:32] ''وہ سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔'' امام راغب کہتے ہیں کہ خَرّ کا استعمال دو باتوں پر دلالت کرتا ہے ایک گرنا اور دوسرے تسبیح کی آواز۔ اور آگے ﴿سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ اس لیے بڑھایا کہ معلوم ہو کہ **خریر تسبیح کی آواز کو کہا ہے** نہ کسی اور شے کو۔ (غ) یہاں بھی یہی لفظ ﴿خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾ اختیار کر کے یہ توجہ دلائی ہے کہ سجدہ میں تسبیح و تحمید الٰہی کی آواز نکلتی تھی۔ پس معلوم ہوا کہ یہ سجدہ یوسف کو نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے لیے تھا جس کی تسبیح و تحمید وہ کر رہے تھے اور لَهٗ کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ یوسف کی اس عزت و مرتبت کی وجہ سے جس میں اب وہ سب شریک ہو گئے تھے سب نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کیا۔

بَدْوٍ۔ بَدَاءَ کے معنی ظاہر ہوا اور بَدْوٍ۔ حَضَرٌ یعنی شہر کے خلاف ہے کیونکہ اس میں ہر چیز جو درمیان میں آئے ظاہر ہو جاتی ہے۔ پس بَدْوٍ بادیہ ہے اور بادیہ میں رہنے والے کو بَادٍ کہا جاتا ہے۔ ﴿سَوَآءً الْعَاكِفُ فِيْهِ وَ الْبَادِ﴾ [الحج: 25:22] ''یکساں، (خواہ) اس میں رہنے والا ہو اور (خواہ) باہر سے آنے والا۔'' ﴿لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ﴾ [الأحزاب: 20:33] ''کہ وہ دیہاتیوں میں جا کر صحرا نشین ہو جائیں۔''

سجدہ یوسف علیہ السلام کو نہ تھا:

باپ اور ماں یا باپ اور خالہ کو تخت پر بٹھانا امتیاز کے لیے تھا۔ اس پر سب سجدہ میں گرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح و حمد کرتے ہیں۔ جیسا کہ خَرُّوْا کے استعمال سے ظاہر ہے۔ یہ سراسر غلط خیال ہے کہ یہ سجدہ یوسف کو تھا تو پھر حمد و تسبیح کس کی تھی؟ اور ظاہر

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰۱

میرے رب تو نے مجھے حکومت سے حصہ دیا اور مجھے باتوں کی حقیقت سکھائی، اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا ولی ہے، مجھے فرمانبرداری کی حالت میں وفات دے اور مجھے نیکوں کے ساتھ ملا۔ (1588)

ہے کہ جس کی حمد و تسبیح تھی اسی کو سجدہ تھا۔ اور یہ کہنا کہ پہلی شرائع میں غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز تھا ایسا ہی ہے جیسا کوئی کہہ دے کہ پہلی شرائع میں شرک جائز تھا۔ شرک یا غیر اللہ کو سجدہ سب شرائع میں ناجائز تھا اور اصول دین ہمیشہ سے ایک ہی رہے ہیں۔

اور حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ یہ میرے رؤیا کی تعبیر ہے تو اس سے سجدہ مراد لینا دوسری غلطی ہے۔ بلکہ **لفظ ھذا میں اسی یوسف کی عظمت وشوکت کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ سے سب نے سجدہ شکر کیا۔** اور خود حضرت یوسف علیہ السلام اگلی آیت میں اس کی تصریح کرتے ہیں کہ تو نے مجھے حکومت اور علم دیئے ہیں۔ یہی مراد سورج اور چاند اور ستاروں کے سجدہ کرنے سے تھی ورنہ یہ کون سی بڑی بات ہے کہ کسی شخص کو اپنے بھائیوں میں اس قدر عظمت حاصل ہو جائے کہ وہ اس کی عظمت کا اعتراف کریں۔ [نمبر: 1516] میں اس رؤیا کی تعبیر کے متعلق مفصل لکھا جا چکا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے کیسے لطیف پیرائے میں بھائیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ میرے بھائیوں نے شیطان کے ورغلانے سے مجھ سے برا سلوک کیا بلکہ یہ کہا کہ شیطان نے مجھ میں اور ان میں فساد ڈلوایا۔ گویا ان کا خاص قصور نہ تھا۔

1588 - راستبازوں کی خواہش کیا پاک ہوتی ہے۔ حکومت بھی ملی، علم بھی ملا اور علم بھی علم دین۔ مگر دل میں ایک ہی تڑپ ہے اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری میں جئیں اور مریں اور صلحا کے زمرہ میں ہوں۔ یہی زندگی کا اصل مقصد ہے۔ مسلمانوں کو سبق دیا تھا مگر کون آج قرآن کی طرف توجہ کرتا ہے۔ راستبازی کا پھل حکومت بھی ہے مگر جو حکومت کو پہلے چاہتے ہیں اور کہتے ہیں راستباز بعد میں بنیں گے وہ قرآن کی بتائی راہ پر نہیں چلتے۔ ہاں اس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو یہ بھی وعدہ ہے کہ جس طرح یوسف آخر کار بادشاہ بنے اور بھائیوں کو ان کے سامنے اعتراف عجز کرنا پڑا، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے والے بھی آخر کار مغلوب ہوں گے اور مسلمانوں کو بادشاہت ملے گی۔ اور چونکہ یہاں بھائیوں کے قائم مقام عرب کے لوگ نہیں اس لیے جس بادشاہت کا وعدہ دیا جاتا ہے وہ **صرف عرب کی بادشاہت نہیں بلکہ اتنی بڑی بادشاہت ہے کہ جس سے عرب کے لوگ بھی فائدہ اٹھائیں۔** جس طرح یوسف کی بادشاہت سے بھائیوں نے فائدہ اٹھایا۔ پس اس میں صاف اشارہ عرب سے باہر کسی عظیم الشان بادشاہت کا ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں جو مسلم، ترمذی، ابوداؤد میں ہے ذیل کے لفظ آتے ہیں: [إِنَّ رَبِّي زَوَى لِي الْأَرْضَ فَرَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَإِنَّ مُلْكَ أُمَّتِي سَيَبْلُغُ مَا زُوِيَ لِي مِنْهَا] (أبوداؤد، كتاب الفتن، باب ذِكْرِ الْفِتَنِ وَدَلاَئِلِهَا، حديث: 4254، سنن ترمذی، كتاب الفتن، مَا جَاءَ فِي سُؤَالِ النَّبِيِّ ﷺ ثَلاَثًا

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو ان کے پاس نہیں تھا جب انہوں نے اپنے معاملہ پر اتفاق کرلیا اور وہ باریک تدبیر کررہے ہیں۔ (1589)

وَ مَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَ لَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

اور اکثر لوگ گو تم کتنا ہی چاہو ایمان نہیں لاتے۔

وَ مَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ ع

اور تو ان سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا وہ صرف تمام قوموں کے لیے نصیحت ہے۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور آسمانوں اور زمین میں کتنے نشان ہیں جن پر لوگ گزرتے ہیں اور وہ ان سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ (1590)

فِي أُمَّتِهِ، حديث:2331، صحيح مسلم، كتاب الفتن وأشراط الساعة، باب باب هَلاَكُ هَذِهِ الأُمَّةِ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ، حديث:7440) میرے رب نے زمین کو میرے لیے سکیڑ دیا یعنی اس کا نقشہ میرے سامنے پیش کیا اور مجھے اس کے مشرقی اور مغربی ممالک دکھائے گئے اور میری امت کی بادشاہت وہاں تک پہنچے گی جو مجھے نقشہ میں دکھایا گیا۔

1589 - **آنحضرت ﷺ کی مخالفت اور اس کا انجام:** حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ کو ﴿تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ [101] پر ختم کرکے انتقال مضمون آنحضرت ﷺ اور آپ کے خلاف تدابیر کرنے والوں کی طرف کیا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں الفاظ ﴿وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ﴾ وہ باریک تدابیر کررہے ہیں صاف اس پر شاہد ہیں اور اگلی آیات کا مضمون بھی صاف یہی ظاہر کرتا ہے۔ پس ﴿اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ﴾ سے مراد بھی وہ خبریں ہیں جو بطور پیشگوئی حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ میں ہیں یعنی مخالفین کی سازش اور کوششیں اور سات سال کا قحط اور بالآخر ان کی ناکامی اور مغلوب ہوکر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آنا اور آنحضرت ﷺ کا ان کو معاف کرنا اور آپ کو وسیع حکومت کا ملنا اور ان کا اس میں حصہ دار ہونا۔ اور اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ کی طرف بھی ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ﴾ [102] میں اشارہ لیا جائے تو اس معنی سے بالکل بجا ہے کہ کتنی وہ باتیں قرآن شریف نے بیان کی ہیں جن سے اعلیٰ درجہ کے اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں۔ حالانکہ بائبل میں وہ باتیں موجود نہیں اور وہاں یہ قصہ اس سے بڑھ کر وقعت نہیں رکھتا جو کسی نے کہا ہے پیرے بود پسرے داشت گم کرد باز یافت۔

1590 - ﴿كَاَيِّنْ﴾۔ اَیّ حرف استفہام ہے۔ ﴿اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ﴾ [آل عمران: 44:3] ''ان میں سے کون مریم کا کفیل بنے۔''

وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

اوران میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر وہ شرک (بھی) کرتے ہیں۔ (1591)

اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

تو کیا وہ اس بات سے نڈر ہو گئے ہیں کہ ان پر اللہ کے عذاب کی بھاری مصیبت آ پڑے یا ناگہاں وہ گھڑی ان پر آ جائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔

﴿اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا﴾ [مریم: 69:19] ''جو رحمٰن کے خلاف سرکشی میں سخت تر تھے۔'' ایسا ہی ﴿اَيًّا مَّا تَدْعُوْا﴾ [بنی إسرائیل: 110:17] ''جس نام سے پکارو۔'' اور ندا میں جب منادی پر اَلْ داخل ہو تو مذکر اور مؤنث میں اَيُّهَا اور مونث میں اَيَّتُهَا یا کے ساتھ بڑھایا جاتا ہے۔ جیسے: [يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا] [يَا اَلنَّاسُ] یا [يَا اَلرَّجُلُ] نہیں کہا جائے گا ﴿اَيَّتُهَا الْعِيْرُ﴾ [70] اور كَاَيِّنْ میں ك حرف تشبیہ ہے اور اَيّ حرف استفہام اور تنوین کی جگہ ہے۔ اور یہ سب بمنزلہ ایک لفظ کے ہے جس کے معنی ہیں رُبَّ یعنی بہت۔ (ل)

چونکہ اس رکوع میں عبرت دلانا مقصود ہے اس لیے بطور تمہید عام لوگوں کی حالت غفلت اور لا پروائی کا ذکر کرتا ہے کہ کتنے نشانوں پر گزر جاتے ہیں مگر ان پر غور نہیں کرتے۔ بلکہ آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں۔ ایک ہی چیز کو دو آدمی دیکھتے ہیں، ایک کے نزدیک اس کی کچھ وقعت ہوتی ہے دوسرا اس سے بڑے بڑے قیمتی سبق حاصل کر لیتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اپنی عادت ایسی بناؤ کہ **ہر نشان سے عبرت حاصل کرو**، ہر تذکرہ سے فائدہ اٹھاؤ۔

1591 - ایک حالت تو کفار کی ہے کہ اللہ پر ایمان بھی لاتے ہیں اور پھر شریک بھی ساتھ ٹھہراتے ہیں۔ **کوئی مشرک قوم نہیں مگر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا بھی ساتھ ساتھ اقرار کرتی ہے**۔ عرب کے لوگ باوجود پتھروں اور درختوں اور بتوں کی پرستش کے، ہندو باوجود اپنے کروڑہا دیوتاؤں اور دیویوں اور بتوں کے خدا کو ایک مانتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر عیسائی ہیں کہ تین خدا کہتے ہوئے خدا کو ایک بھی کہتے ہیں اور تین ایک اور ایک تین کے عقدۂ لاینحل کو قبول کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی **توحید پر فطرت انسانی کی شہادت** ہے اور کوئی قوم اس فطری گواہی کا انکار نہیں کر سکتی۔ گو اس فطرت کی شہادت کے ساتھ خواہشات نفسانی کو ملا کر اور بھی ہزار ہا رب بنا لیے ہیں۔ مگر سب سے بڑھ کر قابل افسوس مسلمانوں کی حالت ہے کہ انہیں ہر قسم کے شرک سے پاک کر کے ایک توحید پر کھڑا کیا گیا تھا انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کو مانتے ہوئے ہزار ہا قسم کے شرک ساتھ ملا لیے ہیں۔ ﴿مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ [الفرقان: 43:25] ''جو اپنی خواہش کو اپنا معبود بناتا ہے۔'' کا شرک تو خفی ہے مگر موٹے شرک جیسے قبر پرستی، پیر پرستی انہوں نے مسلمان قوم کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس موقعہ پر شرک کا ذکر اس لیے کیا کہ جو لوگ شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے اور اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اوپر ذکر آیات اللہ کی طرف توجہ نہ

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

کہہ دے یہ میرا رستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر میں اور جو میری پیروی کرتے ہیں اور اللہ سب نقصوں سے پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ (1592)

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی بستیوں کے رہنے والوں میں سے مردوں کو ہی بھیجا تھا جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے تو کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے۔ اور آخرت کا گھر ان کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ

یہاں تک کہ جب رسول (لوگوں کی طرف سے) ناامید ہو گئے اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ ان کے ساتھ جھوٹ بولا گیا

کرنے کا ہی تھا۔ مسلمان شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے اور اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اوپر ذکر آیات اللہ کی طرف توجہ نہ کرنے کا ہی تھا۔ مسلمان بھی پیر پرستی میں پڑ کر اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ چکے ہیں۔ اس لیے ان مصائب سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے اور عبرت حاصل نہیں کرتے، جو خود ان پر وارد ہو رہی ہیں۔

1592 - جب یہ ذکر کیا کہ یہ تمام لوگ توحید کے ساتھ شرک کو ملا رہے ہیں تو اپنے رستہ کا بھی ذکر کیا کہ وہ **توحید خالص** ہے جو ہر قسم کے شرک سے پاک ہے۔ سب سے زبردست بات جو یہاں بیان فرمائی یہ ہے میں جس بات پر قائم ہوں علیٰ بصیرت ہوں۔ میں ہی نہیں میرے پیرو بھی گویا اچھی طرح اس راہ کے حق ہونے کو دیکھ رہے ہیں اور یقین کامل سے اس پر قائم ہیں۔ پس محمد رسول اللہ ﷺ کی پیروی انسان کو علیٰ بصیرت ایمان پر قائم کرنے والی چیز ہے۔ افسوس کہ کتنے مسلمان ہیں جو آج آپ کی پیروی کی برکت سے اس علیٰ بصیرت مقام پر ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ انہیں اپنے دین کی صداقت کی دلائل کا کچھ بھی علم نہیں رہا، اس سے زیادہ دوسرے لوگوں کو علم ہے۔ حالانکہ ہر ایک مسلمان پر یہ حق تھا کہ وہ اپنے دین کی صداقت کے دلائل سے پورا واقف ہوتا تا کہ علیٰ بصیرت اپنے مذہب پر ہو کر دوسروں کو بھی دعوت دے سکتا۔

نَّشَآءُ ؕ وَ لَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

ہماری مدد ان کے پاس آ پہنچی۔ سو جسے ہم نے چاہا بچ گیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے پھیرا نہیں جاتا۔ (1593)

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ع

ان کے ذکر میں عقل والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو بنائی گئی ہو لیکن اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ہدایت ہے اور ان لوگوں کے لیے رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ (1594)

1593 - یہاں بہت لوگوں کو ضمیروں کی غلط فہمی ہوئی ہے ظَنُّوْٓا میں مراد وہ لوگ ہیں جن کی طرف رسول بھیجے گئے یعنی ان کو اس قدر مہلت دی جاتی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ رسولوں نے جو عذاب کے وعدے ہمارے ساتھ کیے تھے وہ سب انہوں نے جھوٹ ہی کہا تھا۔ چنانچہ مفردات میں ہے: [ظَنُّ الْمُرْسِلَ إِلَيْهِمْ أَنَّ الْمُرْسِلَ قَدْ كُذِبُوْهُمْ فِيْمَا أَخْبَرُوْهُمْ بِهِ أَنَّهُمْ إِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهِمْ نَزَلَ بِهِمُ الْعَذَابُ وَإِنَّمَا ظَنُّوْا ذٰلِكَ مِنْ إِمْهَالِ اللهِ تَعَالٰى إِيَّاهُمْ وَإِمْلَاْئِهِ لَهُمْ] یعنی وہ لوگ جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے انہوں نے ظن کیا کہ رسولوں نے ان سے جھوٹ بولا تھا، جو یہ خبر دی تھی کہ اگر تم ہم پر ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب اترے گا اور یہ ظن انہوں نے اس لیے کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مہلت دی اور لمبا وقفہ دیا اور رسولوں کے مایوس ہونے سے مراد صرف یہ ہے کہ جب ان کی تبلیغ کی طرف لوگوں نے توجہ ہی چھوڑ دی تو انہوں نے سمجھا کہ اب یہ قطعاً ایمان نہیں لائیں گے۔ تو ایسے اوقات میں **نصرت الٰہی** آتی ہے اور فی الواقع نصرت الٰہی اسی کا نام رکھا جاتا ہے جب اسباب کوئی باقی نہ رہیں اور چاروں طرف سے مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہو۔

1594 - **قرآن تفصیل کل شیء ہے سے مراد:** ﴿مَا كَانَ﴾ یعنی [مَا كَانَ الْقُرْاٰنَ] یہ قرآن کوئی افترا کی بات نہیں۔ کیونکہ ایک تو یہ پہلی وحی کی مصدق ہے۔ دوسرے ان تمام اصول دین کی اس نے تفصیل کر دی ہے جو پہلی کتابوں نے مجمل چھوڑ دیئے تھے۔ جیسے مسئلہ توحید، نبوت، معاد جنت و نار، تقدیر وغیرہ۔ کیونکہ جس قدر قرآن کریم نے ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے کسی کتاب نے نہیں ڈالی۔ بلکہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ڈالی۔ اور قرآن کریم نے نہ صرف ان تمام باتوں کو بالتفصیل بیان کر دیا جو پہلے بیان نہ کی گئی تھیں۔ بلکہ اس تفصیل میں دلائل بھی شامل ہیں۔ یعنی جو دعویٰ کیا اس کے دلائل بھی دیئے۔ پھر اصول باطلہ کی تردید بھی کی۔ رہیں فروع، سو ان کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی بہت کچھ انہیں بیان کر دیا اور آئندہ وقتاً فوقتاً بھی ضرورتیں پیش آتی رہیں گی۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ یہ لوگوں کو راہ دکھاتی ہے اور سب ہی کو دکھاتی ہے اور چوتھی یہ کہ جو اسے مان لیتے ہیں ان کے لیے رحمت ہو جاتی ہے۔

سورہ الرعد

نام:

اس سورت کا نام اَلرَّعْدُ ہے اور اس میں 6 رکوع اور 43 آیتیں ہیں۔ یہ نام اس لحاظ سے رکھا گیا ہے کہ وحی الٰہی کو قرآن شریف نے بار بار بارش سے تشبیہ دی ہے اور اس سورت میں بالخصوص یہ ذکر ہے کہ وحی الٰہی سے ہی مردہ دل زندہ ہوتے ہیں۔ جس طرح بارش سے مردہ زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور بارش میں کڑک کو ان حملوں سے بھی تشبیہ دی ہے جو دشمن حق کو نیست و نابود کرنے کے لیے کرتے تھے اور اس سے مراد وہ مصائب بھی ہیں جو مخالفین حق پر آتی ہیں اور درحقیقت یہ مصائب اس تصادم کا نتیجہ ہوتی ہیں جو حق اور باطل کے درمیان ہوتا ہے۔ جس طرح کڑک بھی بادل میں ایک تصادم کا نتیجہ ہے اس لیے دونوں پر اس کا اطلاق ہے۔ تو اس سورت میں جہاں اسلام کی آخری کامیابی اور غلبہ کا ذکر ہے وہاں ان چھوٹی چھوٹی مصائب کا آنا اس آخری کامیابی کے لیے بطور نشان قرار دیا ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام اَلرَّعْدُ رکھا ہے۔

خلاصہ مضمون:

① سب سے پہلے اس سورت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ وحی الٰہی سے انسان کیونکر فائدہ اٹھاتا ہے اور مثالیں دے کر سمجھایا ہے کہ زمین اور آسمانوں میں تمام نظم کا انحصار زوجیت پر ہے یعنی ایک چیز اثر ڈالنے والی موجود ہے تو دوسری اس کے بالمقابل اثر قبول کرنے والی چیز ہے۔ اسی طرح قلب انسانی کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اور بدوں اس تعلق کے جو انسان اور خدا کے درمیان وحی الٰہی سے پیدا ہوتا ہے قلب انسانی اپنے کمال کو حاصل نہیں کر سکتا۔

② پہلے رکوع میں یہ بیان کر کے دوسرے میں بتایا کہ تعلق باللہ کے نتائج اور درحقیقت تمام اعمال کے نتائج عورت کے حمل سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یعنی اس عالم میں ظاہر کوئی نتیجہ کھلے طور پر نظر نہیں آتا مگر اندر ہی اندر وہ نتائج تیار ہوتے رہتے ہیں اور یہ بھی بتایا کہ ان نتائج کو قبول کرنے والے دل مراتب میں فرق رکھتے ہیں اور ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے۔

③ تیسرے رکوع میں ان لوگوں کے جو وحی الٰہی کو قبول کرتے ہیں اور ان کے جو اسے ردّ کر دیتے ہیں انجام کا مقابلہ کیا۔

④ چوتھے میں بتایا کہ قرآن کریم ایک طرف قلوب انسانی کے اندر اور دوسری طرف ظاہر میں بھی ایک انقلاب عظیم پیدا کر کے دکھائے گا۔

⑤ پانچویں رکوع میں بتایا کہ پیروان حق اور مخالفین حق میں ایک کھلا فیصلہ کر دیں گے اور

⑥ چھٹے میں ان نشانوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو حق کی آخری کامیابی پر اس وقت بھی نظر آ رہے تھے۔ جب بظاہر اسلام

چاروں طرف سے مشکلات میں گھرا ہوا تھا اور بتایا کہ دشمنوں کے دلوں کو فتح کرتے چلے جانا اس کی آخری کامیابی کا بین نشان ہے۔

تعلق:

الٓرٰ کے مجموعہ میں یہ چوتھی سورت ہے۔ اس سے پہلی سورت میں جب حضرت یوسف علیہ السلام کے ذکر میں سمجھایا کہ آخر کار محمد رسول اللہ ﷺ کے سامنے آپ کے دشمن اور آپ کے خلاف منصوبے کرنے والے کس طرح مغلوب ہوں گے تو اس میں بھی اسی حق کی آخری کامیابی اور اس کی وجوہات کو کھول کر بیان فرمایا اور یہ بھی بتایا کہ اس آخری غلبہ کے نشان کس طرح اب بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔

زمانہ نزول:

وہی ہے جو باقی اس مجموعہ کی سورتوں کا ہے۔ اس سورت میں جو دشمنوں کے مکر یعنی آنحضرت ﷺ کے خلاف منصوبوں کا ذکر ہے وہ بتاتا ہے کہ یہ سورت ہجرت سے کچھ پہلے کی ہے۔ جب آپ کے خلاف منصوبے ترقی پر تھے اور زمین کے گھٹانے کا ذکر جو [آیت: 41] میں ہے بتاتا ہے کہ اسلام کی کامیابی اب دور دور ہونے لگی تھی۔ اور غالباً مدینہ میں اسلام کے پھیل جانے کی طرف بھی اس میں اشارہ ہے۔ جس سے اس مجموعہ سور کے زمانہ نزول پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ یہ گیارھویں بارھویں سال بعثت سے تعلق رکھتی ہیں۔

ٰایَاتُھَا 43 (13) سُوْرَۃُ الرَّعْدِ مَدَنِیَّۃٌ (96) رُکُوْعَاتُھَا 6

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ①

میں اللہ خوب جانتا اور دیکھتا ہوں۔ یہ کتاب کی آیتیں ہیں اور وہ جو تیرے رب سے تیری طرف اتارا گیا ہے حق ہے لیکن اکثر لوگ نہیں مانتے۔(1595)

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ②

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے بلند کیا جنہیں تم دیکھتے ہو، پھر عرش پر قرار پکڑا اور سورج اور چاند کو کام پر لگایا۔ ہر ایک ایک مقرر وقت تک چل رہا ہے۔ وہ کاروبار کی تدبیر کرتا ہے، باتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔(1596)

1595 - ﴿الٓمّٓرٰ﴾ کے معنی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں [اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ وَ اَرٰى] (د) گویا الٓرٰ میں جو ان سورتوں کے شروع میں آتا ہے مر بڑھا دیا ہے جو اعلم کا قائم مقام ہے اور اس میں حق کو تباہ کرنے والوں کی سزا کے ساتھ علمی رنگ میں ان کی آخری ناکامی اور نامرادی کے دلائل دیئے ہیں اس لیے یہاں علم اور رویت دونوں صفات کو جمع کیا ہے۔

حقانیت قرآن:

﴿اٰيٰتُ الْكِتٰبِ﴾ عموماً جہاں اس طرح کی ترکیب آئی ہے کہیں فرمایا ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ①﴾ ''یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔'' جیسے سورۂ یونس کے شروع میں، کہیں ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ①﴾ ''یہ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔'' جیسے سورہ یوسف کے شروع میں۔ دونوں جگہ وصف نے بتا دیا کہ قرآن شریف مراد ہے۔ یہاں لفظ کو عام رکھا ہے جس سے معلوم ہوا کہ جنس کتاب مراد ہے یعنی یہ وحی الٰہی کی آیات ہیں۔ اس لیے ساتھ ہی فرمایا کہ یہ جو تیری طرف نازل ہوا ہے حق ہے اور اسی کی حقانیت پر اس سورت میں دلائل علمی بھی دیئے ہیں۔

1596 - عَمَدٍ۔ عَمَدٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا قصد کرنا اور اس سے سہارا لینا۔ پس عَمَدٌ اور تَعَمَّدٌ خلاف سہو ہے یعنی ارادۃً ایک کام کرنا ﴿وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا﴾ [النسآء: 93:4] ''اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے۔'' ﴿وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾

وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ

اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر قسم کے پھلوں سے

[الأحزاب: 5:33] ''لیکن (وہ گناہ ہے) جو تمہارے دل عمداً کریں۔'' اور عَمُوْدُ خیمہ کی چوب کو کہتے ہیں جس پر خیمہ کا سہارا ہوتا ہے اور ہر چیز جس پر انسان سہارا لے لوہے کی ہو یا لکڑی کی یا ستون اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اس کی جمع عُمُدٌ اور عَمَدٍ آتی ہے ﴿فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ﴾ [الهمزة: 9:104] ''ستونوں میں بند کر دی جائے گی۔'' (غ)

آسمانوں کے غیر مرئی ستون:

﴿رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد سے یہ معنی مروی ہیں اور الفاظ بھی خود اسی معنی کو چاہتے ہیں کہ آسمانوں کو بلند رکھا ہوا ہے بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھتے ہو۔ گویا آسمانوں اور زمین کے درمیان کوئی ایسے ستون ہیں جنہیں ہم نہیں دیکھتے۔ یعنی ان کا باہم کوئی تعلق تو ہے مگر وہ ان آنکھوں سے نظر آنے کے قابل نہیں۔ اور چونکہ یہاں ساری بحث ہی بعض تعلقات پر ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے، جیسے سورج اور چاند کا تعلق یا جیسے زمین اور آسمان کا تعلق۔ یا جیسے پہاڑوں اور دریاؤں کا تعلق، رات اور دن کا تعلق وغیرہ۔ اس لیے یہی معنی درست ہیں اور آج سائنس بھی اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ ہر ایک نظام کے اندر وہ تعلقات موجود ہیں جو اس کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ بغیر ان تعلقات کے جیسے کشش ثقل وغیرہ یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ سو یہی وہ ستون ہیں جنہیں ہم نہیں دیکھتے۔

نظام سماوی میں تعلقات اور اثرات:

قرآن کریم کے حق ہونے کے دعویٰ کے بعد فوراً یہ مضمون شروع ہو جاتا ہے کہ آسمان ایسے بنائے اور سورج اور چاند سے یہ کام لیا اور اس کا نتیجہ بھی بتایا کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔ ان باتوں کا باہم کیا تعلق ہے؟ قرآن شریف نے بڑی کثرت سے ظاہری امور کو امور باطنی کے لیے بطور شہادت پیش کیا ہے اور صحیفہ قدرت کے نظاروں سے عالم روحانیت کے نظاروں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ لقاء اللہ یا اللہ کی ملاقات یہ چاہتی ہے کہ انسان اور اس کے رب کے درمیان کوئی تعلق ہو جسے حاصل کیے بغیر نہ صرف انسان کمال کو ہی نہیں پہنچ سکتا بلکہ وہ سارا نظم ہی تباہ ہو جاتا ہے۔ اور مذہب کی اصل غرض اسی تعلق کی طرف توجہ دلانا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ مخلوق پر غور کرو، وہاں تم بڑے سے بڑے اجرام میں بھی ایک تعلق کو موجود پاؤ گے جس تعلق سے ہی وہ اپنے وجود کی غرض کو پورا کر رہے ہیں اور جس کے قیام کے بغیر نظام عالم تباہ ہو جائے۔ مثلاً یہی نظام شمسی لے لو جو ہماری زمین کے لیے بمنزلہ ایک سماء کے ہے۔ یہ سب نظام کواکب اور سورج کے ایک دوسرے سے تعلقات پر مبنی ہے۔ اسی طرح پر اس نظام کا تعلق کسی اور نظام سے ہے جیسا کہ موجودہ تحقیقات نے ثابت کیا ہے۔ پھر سورج اور چاند کے لفظ لا کر توجہ دلائی کہ کس طرح سورج کے نور کا اثر چاند قبول کرتا ہے حالانکہ چاند بالذات روشن نہیں اور ﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ کہہ کر توجہ دلائی کہ

جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

اس میں دو دو (یعنی) جوڑے بنائے، وہ دن پر رات کا پردہ ڈالتا ہے اور اس میں ان لوگوں کے لیے یقینی نشان ہیں جو فکر کرتے ہیں۔ (1597)

وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَ نُفَضِّلُ

اور زمین میں پاس پاس ٹکڑے ہوتے ہیں اور انگوروں کے باغ اور کھیتی اور کھجوریں ایک ہی جڑ سے کئی کئی نکلی ہوئیں اور الگ الگ جڑوں سے نکلی ہوئیں (سب کو) ایک ہی پانی دیا جاتا ہے اور ہم ان میں سے

اس عالم کا سارا نظام کاروبار کی کل تدابیر اسی ایک اصول پر ہے کہ ایک چیز اثر ڈالتی ہے اور دوسری اثر قبول کرتی ہے۔ ﴿يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ﴾ یوں ہم کھول کر باتیں بیان کرتے ہیں تاکہ تم کو یقین آ جائے کہ لقاء اللہ بھی ایک حقیقت ہے یعنی اسی طرح انسان کا بھی ذات باری سے **ایک تعلق ہے** جو گو آنکھوں سے نظر نہیں آتا مگر ان لوگوں کی زندگیوں میں نظر آتا ہے جو اس تعلق کو کمال کو پہنچاتے ہیں کہ کس طرح وہ عام انسانوں سے ممیز ہو جاتے ہیں۔ اسی مضمون کو اگلی آیت میں اور واضح کیا ہے اور دوسری جگہ صراحت سے بیان فرمایا ہے ﴿وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۝ وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾ [الذاریات:51:47-50] اے انسان غور کر کہ آسمان کو ہم نے کس طرح وسعت دی ہے اور زمین کو کیا اچھا بچھایا ہے (بایں ان دونوں میں کیسا تعلق رکھا ہے کہ ایک میں اثر ڈالنے کا مادہ ہے تو دوسرے میں اثر قبول کرنے کا۔ اگر ایک بھی ان دونوں میں سے اپنا کام چھوڑ دے تو کس طرح یہ نظام بگڑ جاتا ہے۔ پھر ان دو پر کیا انحصار ہے) ہم نے ہر چیز کے ہی جوڑے جوڑے پیدا کیے ہیں (ساری مخلوق میں غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ایک چیز کے اثر ڈالنے اور دوسری کے اثر قبول کرنے سے ہی سلسلہ نظام عالم چلتا ہے) پس اے انسان تو بھی اللہ کی طرف بھاگ آ کیونکہ اس کے بغیر وہ نظام روحانی قائم نہیں رہ سکتا جو انسان کی زندگی کی علت غائی ہے۔

1597- **ہر چیز کے ازواج:** ﴿رَفَعَ السَّمٰوٰتِ﴾ کے مقابل یہاں ﴿مَدَّ الْاَرْضَ﴾ سے شروع کیا اور یوں آسمان اور زمین کے تعلق زوجیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پھر جس طرح وہاں سورج اور چاند ہیں، یہاں پہاڑوں اور دریاؤں کا کیا عجیب تعلق ہے کہ پہاڑ بادلوں کو کھینچتے ہیں اور یہاں پانی برستا ہے۔ تو اس سے دریا بنتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ تمام قسم کے پھلوں میں بھی جوڑے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے جس کا آج ہی دنیا کو علم ہوا، زمانہ نزول قرآن کے وقت دنیا اس سے بے خبر تھی۔ پھر اور ترقی کر کے فرمایا رات کی تاریکی کا پردہ دن پر ڈالتا ہے گویا رات اور دن میں بھی ایک تعلق زوجیت ہے۔ ورنہ رات دن کو ثمرات سے کیا تعلق۔ فرمایا نشان تو اس میں ہیں مگر فکر کرے بغیر ان کا علم نہیں ہوتا۔

بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِى الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۴

بعض کو بعض پھل میں فضیلت دیتے ہیں۔اس میں لوگوں کے لیے نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔(1598)

وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ

اور اگر تو تعجب کرے تو ان کا یہ کہنا جائے تعجب ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو پھر ایک نئی پیدائش میں آئیں گے۔یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کا انکار کرتے ہیں اور

1598 - ﴿قِطَعٌ﴾۔ قَطَعَ، قِطْعَةٌ کی جمع ہے ایک ٹکڑا ﴿قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ﴾[یونس: 27:10] ''رات کا سیاہ ٹکڑا'' اور قِطَعَ اور قِطْعَةٌ کے ایک ہی معنی ہیں ﴿فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ﴾[هود: 81:11] ''تو کچھ رات سے اپنے اہل کو لے کر نکل۔''

﴿مُّتَجٰوِرٰتٌ﴾۔ جَارَ کے معنی ہیں ہمسایہ اور پھر محض قریب پر اس کا استعمال ہوا ہے۔اور [جَاوَرَ۔تَجَاوَرَ] کے معنی ہیں ایک دوسرے کے پاس ہوئے ﴿لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا﴾[الأحزاب: 60:33] ''وہ اس (شہر) میں تیرے ساتھ رہنے نہ پائیں گے مگر تھوڑا۔'' (غ) اور مُتَجَاوِرٌ ایک دوسرے کے پاس۔

﴿صِنْوَانٌ﴾۔ صِنْوَ شاخ جو درخت کی جڑ سے نکلے اور صِنوَانٍ اس کا تثنیہ اور صِنْوَانٌ جمع ہے۔(غ)

جب یہ بیان کیا کہ انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے تو اب باوجود اس تعلق کے **اختلاف مراتب** کی وجہ بیان فرمائی کہ یہ اختلاف خود اس استعداد سے بھی پیدا ہوتا ہے جو قبولیت کے لیے چیزوں میں ہے۔ چنانچہ زمین تو ایک ہی ہے مگر اس کے مختلف قطعات کو دیکھو کہ پاس پاس قطعات ہوتے ہیں پھر ان میں سے بعض ایک قسم کے پھل کو اچھا اگاتے ہیں بعض دوسری قسم کے۔ پھر باوجود اس کے کہ ایک ہی پھل ہو اور ایک ہی پانی ملتا ہو ان کے ذائقوں میں اختلاف ہوتا ہے اسی لحاظ سے یہاں لفظ اُكُلِ اختیار کیا ہے کہ پھل اور ذائقہ دونوں پر آ سکے۔اس کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 1024]۔

تردید تناسخ:

اس میں مسئلہ تناسخ کی بھی تردید کر دی ہے کہ اگر انسانوں میں اختلاف مراتب ہے تو یہ اختلاف تقاضائے قدرت سے ہے بدون اس اختلاف کے دنیا رہ ہی نہیں سکتی۔ یہاں تک کہ زمین کے مختلف قطعات میں بھی اختلاف ہے۔ پس جن لوگوں نے محض اختلاف مراتب و استعداد انسانی کو دیکھ کر یہ خیال کر لیا ہے کہ یہ کسی پہلی زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے انہوں نے عقل سے کام نہیں کیا۔ ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ اختلاف تمام عالم میں موجود ہے اور موجودات اس اختلاف کے بغیر ہو ہی نہ سکتی تھی۔ اختلاف مخلوق کا خاصہ ہے۔ ہاں اس اختلاف میں جو وحدت نظر آتی ہے وہ اس بات کی شہادت ہے کہ ایک ہی خالق کے ہاتھ سے یہ نکلی ہوئی چیزیں ہیں۔

فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

یہی ہیں جن کی گردنوں میں زنجیریں ہیں اور یہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔ (1599)

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ

اور بھلائی سے پہلے تجھ سے دکھ کی جلدی کر رہے ہیں اور ان سے پہلے عبرت ناک مثالیں گزر چکی ہیں اور تیرا رب لوگوں کو باوجود ان کے ظلم کے معاف کرتا رہتا ہے

1599 - اَغْلٰلُ۔ غَلَلَ کے معنی درمیان میں ہونا ہیں اور غُلّ وہ چیز ہے جس سے انسان قید کیا جائے یعنی اس کے اعضا اکٹھے باندھ کر درمیان میں کر دیئے جائیں۔ اس کی جمع اَغْلَالٌ ہے اور ﴿اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا﴾ [یٰسٓ: 8:36] ''ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈالے ہیں۔'' سے مراد ہے [مَنَعَهُمْ فِعْلَ الْخَيْرِ] یعنی انہیں نیکی کے کاموں سے روک دیا۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسا دلوں پر مہر وغیرہ کا لگانا۔ (غ) اور ﴿وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ میں زجاج کا قول ہے کہ اس سے مراد ان کی وہ رسوم ہیں جن میں جکڑے ہوئے تھے یا ایسی باتیں جو ان میں روک کے طور پر تھیں۔ جیسا مثال کے طور پر کہتے ہیں [هٰذَا طَوْقٌ فِيْ عُنُقِكَ] حالانکہ طوق فی الحقیقت مراد نہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ تم پر لازم کر دیا گیا ہے اور ﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ﴾ [المؤمن: 71:40] ''جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے۔'' میں مراد ایسے اعمال ہیں جن میں وہ جکڑے ہوئے ہیں۔ (ل) اور تفاسیر میں بھی یہاں یہ معنی جائز قرار دیئے ہیں کہ مراد ایمان سے روکنا وغیرہ ہے۔ (ر) یا ان کے برے رسوم و رواج جو زنجیروں کی طرح ان کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ (ح)

بعث بعد الموت اور اس کا انکار:

تعلق باللہ کا کمال چونکہ زندگی بعد الموت میں حاصل ہوتا ہے اس لیے اب مضمون کا انتقال اس طرف کیا ہے اور اس زندگی یعنی بعد الموت کو خلق جدید یا ایک نئی پیدائش قرار دیا ہے وہ یہ زندگی نہیں۔ اور دوسری جگہ صفائی سے فرمایا ﴿وَ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [الواقعة: 61:56] یعنی ایسی زندگی تمہیں دیں گے جس کو تم نہیں جانتے۔ اس خلق جدید کے انکار کو انکار رب قرار دیا ہے۔ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ﴾ اس لیے کہ گو ایسے لوگ خدا کو مانتے ہوں مگر اس کی صفت ربوبیت کا وہ انکار کرتے ہیں کیونکہ اس کی صفت ربوبیت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان کو اس کے کمال روحانی تک پہنچائے اور وہ کمال زندگی بعد الموت میں حاصل ہوتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ ان کی گردنوں میں طوق ہیں یعنی جو لوگ لقاء اللہ کے منکر ہوتے ہیں ان کے قوائے روحانی نشوونما پانے سے رک جاتے ہیں۔ جس طرح وہ شخص جس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے جائیں کاروبار سے رک جاتا ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ لقاء اللہ سے انکار کر کے قوائے روحانی کا نشوونما رک جاتا ہے اور اس طرح رک جانے کا نتیجہ یہ

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۶

اور تیرا رب بدی کی سزا دینے میں سخت (بھی) ہے۔ (1600)

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝۷ ع

اور جو کافر ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس پر اپنے رب کی طرف سے نشان کیوں نہیں اتارا جاتا۔ تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کے لیے راہ دکھانے والا ہے۔ (1601)

ہوا کہ وہ اصحاب النار ہیں۔ گویا قوائے روحانی کی نشوونما سے جنت پیدا ہوتی ہے اور ان کے نشوونمار کے رک جانے سے آگ پیدا ہوتی ہے اور یہی انسان کا دوزخ ہے ﴿وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى﴾ [بنی إسرائیل: 72:17] ''اور جو کوئی اس (دنیا) میں اندھا رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔''

1600 - ﴿الْمَثُلٰتُ﴾۔ مَثُلَةٌ کی جمع ہے اور وہ وہ سزا ہے جو انسان پر آئے تو اس کو ایک مثال بنا دے، جس سے دوسرا رک جائے۔ (غ) بخاری میں ہے کہ یہ مَثُلَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی اشباہ وامثال ہیں۔

دکھ کو بھلائی سے پہلے چاہتے ہیں اور اس کے لیے جلدی کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر حق کو قبول کریں، اس پر عمل کریں تو ان کے لیے بھلائی ہے اور اگر اسے رد کریں تو ان کے لیے دکھ ہے۔ پس رد کرنے میں جلدی کرنا گویا دکھ کے لیے جلدی کرنا ہے۔ اپنے فائدہ کی بات کو چھوڑ کر دکھ کو قبول کرتے ہیں اور یہ بھی غور نہیں کرتے کہ پہلے لوگوں نے یہی راہ اختیار کر کے کیسی سزا پائی۔

1601 - آیۃ سے مراد یہاں وہی نشان ہلاکت ہے جس کی طرف پچھلی آیت میں بھی اشارہ ہے ﴿يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ﴾ یعنی حق کی مخالفت کرتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت کی وجہ سے پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا تو کہتے ہیں وہ نشان ہلاکت کیوں نہیں آتا جس سے ڈرایا گیا تھا۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ نبی صرف منذر ہے یعنی بدی کے بدانجام سے ڈرا دینا اس کا کام ہے۔ اس انجام کو لانا اس کے اختیار میں نہیں۔ یہ نشان کا انکار نہیں بلکہ بتایا ہے کہ جب ڈرایا جاتا ہے تو وہ عذاب بھی آ کر ہی رہے گا۔ اور یہ جو بڑھایا ﴿وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ تو مطلب یہ ہے کہ چونکہ آپ کو ہر قوم کا ہادی بنا کر بھیجا گیا ہے اس لیے وہ باتیں جن سے آپ ڈراتے ہیں وہ بھی ہر قوم کے لیے ہیں۔ پس جو کوئی قوم بھی آپ کی مخالفت کرے گی اسی کے لیے یہ انذار بھی ہے۔ یہ آیت علاوہ اس کے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت عامہ کا ذکر کرتی ہے، ختم نبوت پر بھی دلیل ہے۔ اس لیے کہ کل اقوام عالم کی ہدایت اور انذار ہمیشہ کے لیے آپ کے سپرد کیا گیا۔ عذاب انذار کا نتیجہ ہے۔ جب انذار آپ کی طرف سے ہوا تو عذاب بھی جو آئے گا وہ آپ کے انکار کی وجہ سے آئے گا اور یہ انذار اگر آپ کے پیرو کریں تو بھی آپ کی طرف سے ہی ہوگا۔ کیونکہ اس حق کے بعد جو نبی ﷺ لائے دوسرا کوئی حق آنے والا نہیں۔ بعض نے ﴿وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ کے معنی یوں بھی کیے ہیں کہ ہر قوم میں ایک ہادی ہو گزرا مگر یہ معنی یہاں موزوں نہیں۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ ؕ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝۸

اللہ جانتا ہے جو ہر ایک مادہ حمل میں لیتی ہے اور جسے رحم گھٹاتے ہیں اور جسے وہ بڑھاتے ہیں اور ہر ایک چیز اس کے ہاں اندازہ سے ہے۔ (1602)

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝۹

وہ غائب اور حاضر کا جاننے والا بہت بڑا بلند ہے۔ (1603)

1602 - ﴿تَحْمِلُ﴾۔ حِمْلٌ ظاہری بوجھ اور حَمْلٌ باطنی بوجھ پر بولا جاتا ہے جیسے پیٹ میں بچہ اور بادل میں پانی اور درخت میں پھل ﴿وَ اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا﴾ [فاطر: 18:35] ''اور اگر کوئی بوجھ میں دبا ہوا اپنے بوجھ (کے ہٹانے) کے لیے بلائے۔'' اور اِحْتَمَل اور حَمَلَ کے ایک ہی معنی ہیں۔ (غ)

پیچھے بھی اعمال کی جزا سزا کا ذکر ہے اور آگے بھی اور درمیان میں یہ ایک آیت ہے۔ پس اس سے مراد صرف اس قدر لینا کہ اللہ کو یہ علم ہے کہ عورت کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی اور مدت حمل آٹھ یا نو یا دس مہینے ہے درست نہیں۔ بلکہ جس طرح پچھلے رکوع میں آسمان اور زمین کی اور پھر ہر شے میں ایک اثر ڈلنے والے اور ایک اثر قبول کرنے والے کی مثالیں دی تھیں، اسی طرح یہاں عورت کے حمل کو بطور ایک مثال کے بیان کیا ہے۔ گویا عمل کرنے والا بمنزلہ ایک مادہ کے ہے اور جو وہ عمل کرتا ہے وہ بطور حمل کے ہے۔ جس طرح عورت کے پیٹ میں وہ چیز نظروں سے مخفی ہوتی ہے جو اندر ہی اندر تیار ہوتی ہے اسی طرح اعمال کے نتائج نظروں سے مخفی ہوتے ہیں۔ لیکن ایک صورت وہ اندر ہی اندر تیار کرتے جاتے ہیں۔ گویا وحی الٰہی اثر ڈالنے والی چیز ہے۔ انسان اثر قبول کرنے والا ہے۔ اعمال جو اس اثر سے پیدا ہوتے ہیں وہ بمنزلہ حمل کے ہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ بعض کو رحم تکمیل تک نہیں پہنچاتے اور بعض کو بڑھاتے ہیں تو یہی حالت اعمال میں ہے۔ بعض وقت ایک انسان اچھے عمل کرتا ہے جن سے اچھے نتائج کی توقع ہونی چاہیے مگر ایک مرتبہ کوئی ایسی آفت آجاتی ہے کہ وہ نتیجہ تکمیل پذیر ہونے سے رہ جاتا ہے۔ جس طرح حمل بعض وقت پوری طرح پرورش نہ پانے کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں اور بعض پوری قوت پا کر کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ اور آخر پر ﴿كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ﴾ کہہ کر انہی نتائج اعمال کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی ہر چیز کا (اور یہاں ذکر بالخصوص اعمال کا ہے) اسی پر قیاس کر لو۔ چنانچہ اگلا سارا مضمون اس معنی کی تائید کرتا ہے۔ یہاں تک کہ [آیت: 11] میں صاف فرمایا کہ ہر عمل کو اللہ تعالیٰ کے محفوظ کرنے والے فرشتے محفوظ کرتے رہتے ہیں۔ گویا وہ ایک نتیجہ پیدا کرتا رہتا ہے۔

1603 - ﴿الْكَبِيْرُ﴾۔ كِبَرٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 53] اور كِبَر۔ کے معنی رفعت اور شرف بھی ہیں یا شرف میں رفعت اور اَلْكَبِيْرُ اور اَلْمُتَكَبِّرُ اللہ کے اسماء میں اسی معنی میں ہیں یعنی عظمت و کبریاء والا اور كِبْرِيَاءٌ کمال ذات اور کمال وجوب پر دلالت کرتا ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کے وصف میں نہیں آتا۔ (ت) اور چونکہ کبیر اور صغیر نسبتی اسماء ہیں اور کبیر کا اطلاق بمعنی رئیس

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝۱۰

برابر ہے تم میں جو چھپ کر بات کرے اور جو اسے پکار کر کہے اور جو رات کو چھپ رہا ہو اور جو دن کو چل رہا ہو۔ (1604)

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا

اس کے لیے اس کے آگے اور پیچھے (اعمال کا) پیچھا کرنے والے ہیں جو اسے اللہ کے حکم سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو (نہ بدلیں) اور جب اللہ کسی قوم کے لیے تکلیف کا

وغیرہ بھی ہو جاتا ہے جیسے ﴿اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ﴾ [طٰہٰ: 71:20] ''یقیناً وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔'' اس لیے اللہ اکبر میں یہ بتانا مراد ہے کہ وہ سب سے بڑا ہے۔ جیسے اَلْاَعْلٰی میں دوسروں پر اس کا علو مراد ہے۔

﴿الْمُتَعَالِ﴾۔ عُلُوّ پستی کی ضد ہے اور [عَلَا يَعْلُوْا] سے مصدر عُلُوْ اور [عَلِيَ يَعْلٰى] سے عَلًا ہے اور ان میں سے پہلا اچھے اور برے دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے اور دوسرا صرف اچھے معنی میں اور پہلے کی مثالیں قرآن شریف میں بہت ہیں۔ ﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ﴾ [القصص: 4:28] ''فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کی۔'' ﴿وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ﴾ [المؤمنون: 46:23] ''اور وہ سرکش لوگ تھے۔'' ﴿لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ﴾ [القصص: 83:28] ''جو زمین میں بڑائی نہیں چاہتے۔'' ﴿وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا﴾ [بنی إسرائیل: 4:17] ''اور بڑی سرکشی اختیار کرو گے۔'' اور دوسرے یعنی عَلِيّ سے عَلِيٌّ ہے جس کے معنی رفیع القدر ہیں اور مراد یہ ہے کہ وہ اس سے بلند ہے کہ وصف کرنے والوں کا وصف یا عارفوں کا علم اس کا احاطہ کر سکے اور تعالیٰ سے بھی یہی مراد ہے اور باب تفاعل اس صورت میں مبالغہ کے لیے ہے۔ (غ) اسی سے متعال ہے۔

1604 - مُسْتَخْفٍ۔ خَفِيَ کے معنی چھپ گیا اور اِخْفَاءٌ چھپانا، اِسْتِخْفَاءٌ طلب اخفاء یعنی چھپانے کی کوشش کرنا ﴿لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ﴾ [ھود: 5:11] ''تاکہ اس سے چھپے رہیں۔'' (غ) اسی سے مُسْتَخْفِيْ اسم فاعل ہے۔

سَارِبٌ۔ سَرَبَ کے معنی نشیب کی طرف جانا ہیں ﴿فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا﴾ [الکھف: 61:18] ''تو اس نے چلتے چلتے اپنا رستہ دریا میں لے لیا۔'' اور سَارِبٌ مطلق چلنے والے کو کہتے ہیں۔ (غ) ہوسکتا ہے کہ یہاں ان خفیہ منصوبوں اور کھلی شرارتوں کی طرف بھی اشارہ ہو جو نبی کریم ﷺ کے خلاف کی جاتی تھیں۔

فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ⑪

ارادہ کرتا ہے تو وہ کسی طرح رد نہیں ہو سکتی۔ اور ان کے لیے اس کے سوائے کوئی حمایتی نہیں۔ (1605)

1605 - ﴿مُعَقِّبٰتٌ﴾۔ عَقِبٌ سے ہے اور تعقیب کے معنی ایک چیز کو دوسری کے پیچھے لانا ہیں ﴿لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ﴾ [الرعد: 41:13] یعنی جب اس کا حکم آ جائے تو پھر اس کے پیچھے کوئی دوسرا حکم کرنے والا نہیں۔ مطلب یہ کہ آخری حکم اسی کا ہے اس کا رد کرنے والا کوئی نہیں۔ اور مُعَقِّبٰتٌ کے معنی کیے گئے ہیں وہ فرشتے جو انسان کی حفاظت کرتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں۔ (غ) اور جو شخص ایک کام کرے پھر اس کی طرف عود کرے تو یہ تعقیب ہے۔ اسی لیے ایسے شخص کو معقب کہا جاتا ہے جو نماز کے بعد نماز پڑھتا ہے یا غزوہ کے بعد غزوہ کرتا ہے۔ (ل) اور یا ملائکہ کو مُعَقِّبٰتٌ اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ وہ انسان کے اقوال و افعال کا پیچھا کرتے ہیں یعنی اسے لکھ کر محفوظ کرتے چلے جاتے ہیں۔ (ر) اور مُعَقِّبَةٌ میں تا مبالغہ کے لیے ہے یا [مُعَقِّبَةٌ، مُعَقِّبٌ] کی جمع ہے اور مُعَقِّبٰتٌ جمع الجمع ہے۔

معقبات سے مراد کراماً کاتبین ہیں:

مُعَقِّبٰتٌ کون ہیں؟ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مصائب وغیرہ کے پہنچنے سے انسان کی حفاظت کرتے ہیں مگر یہ معنی نہ تو لفظ معقبات کے لحاظ سے چسپاں ہیں اور نہ ہی سیاق و سباق کے لحاظ سے۔ معقبات کے ایک معنی کے لحاظ سے یہ وہ فرشتے ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور یہ فرشتے وہی ہیں جو انسان کی حسنات اور سیئات کو لکھنے والے ہیں اور یہی [مَلَائِكَةُ اللَّيْلِ] اور [مَلَائِكَةُ النَّهَار] کہلاتے ہیں اور دوسرے معنی کے لحاظ سے تو بالکل صاف ہیں [اِنَّهُمْ يُعَقِّبُوْنَ اَقْوَالَ الشَّخْصِ وَ اِفْعَالِهٖ اَیْ يَتَّبِعُوْنَهَا وَ يَحْفِظُوْنَهَا بِالْكِتَابَةِ]۔ پس یہ وہی ملائکہ ہیں جن کو دوسری جگہ ﴿كِرَامًا كَاتِبِيْنَ﴾ کہا ہے اور سیاق و سباق کے لحاظ سے بھی ظاہر ہے کہ یہاں ذکر انسان کی بلاؤں سے حفاظت کا نہیں ہے بلکہ اس کے اعمال کی حفاظت کا ہے۔ جیسا کہ اس سے پچھلی آیت سے اور اگلے الفاظ ﴿لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ﴾ سے ظاہر ہے اور خود قرآن کریم کی شہادت بھی بالصراحت موجود ہے کہ انہی ملائکہ کو حافظ اور نگہبان کہا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ⑱﴾ [قٓ: 18:50] کوئی بات منہ سے نہیں نکلتی مگر اس کے پاس ایک حفاظت کرنے والا تیار رہتا ہے اور دوسری جگہ ہے ﴿وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ⑩ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ⑪ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ⑫﴾ [الانفطار: 82:10-12] تم پر حفاظت کرنے والے ہیں۔ کراماً کاتبین وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ اور یہی مراد ﴿يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ سے ظاہر ہے اور يَحْفَظُوْنَهٗ میں ضمیر یا اس عمل کی طرف ہے جو انسان کرتا ہے اور یا خود کرنے والے انسان کی طرف ہے کہ اس کی حفاظت سے مراد اس کے اعمال کی ہی حفاظت ہے۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو حفاظت کے قابل ہے اور اس کتاب کے متعلق ہی دوسری جگہ فرمایا ﴿وَ عِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ﴾ [قٓ: 4:50] ''اور ہمارے پاس حفاظت کرنے والی کتاب ہے۔''

اعمال کی ذمہ داری کے احساس میں ہی شرف انسانیت ہے۔ جس قدر انسان ترقی کرتا چلا جاتا ہے اسی قدر اس میں اپنے اعمال

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾

وہی ہے جو تمہیں ڈرانے اور امید دلانے کو (بجلی) کی چمک دکھاتا ہے اور بھاری بادل اٹھاتا ہے۔ (1606)

وَ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ وَ یُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَ هُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾

اور گرج اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور فرشتے اس کے خوف سے اور وہ بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہتا ہے انہیں گراتا ہے اور وہ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور وہ بڑی قوت والا ہے۔ (1607)

کی ذمہ داری کا احساس زیادہ سے زیادہ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اور اس احساس ذمہ داری کو مذہب نے اور بالخصوص **اسلام نے کمال تک پہنچادیا**۔ جب یہ قانون بتادیا کہ کسی حال میں ہو ہر ایک عمل لکھ لیا جاتا ہے یعنی محفوظ کرلیا جاتا ہے اس لیے کوئی عمل بھی انسان کا بلانتیجہ نہیں رہتا۔ اس اصول کے تسلیم کرنے میں نسل انسانی کی حقیقی بہتری ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ **اگر کوئی قوم اپنی بہتری چاہتی ہے تو اس کے افراد اپنی حالت کو تبدیل کریں**۔ بدون اس کے قوم کی حالت بہتر نہیں ہوسکتی۔ آج مسلمان اس اصول کو فراموش کرکے ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں اور اپنے نفسوں کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے تو وہ ٹلتا نہیں۔ تو مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ انسان کے اعمال پر ہے۔ جب ایک قوم کے اعمال کا یہ تقاضا ہوجاتا ہے کہ اس پر مصیبت آئے تو پھر واویلا سے وہ دور نہیں ہوتا۔ ہاں پھر بھی اصلاح کریں تو اللہ تعالیٰ اسے دور کردیتا ہے۔

1606 - بَرْق۔ وہ چمک اور رَعْدٌ وہ گرج ہے جو بادل سے پیدا ہوتی ہے۔

﴿ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴾ ثِقَالٌ۔ ثَقِیْلَةٌ کی جمع ہے بھاری۔ سَحَابٌ چونکہ اسم جنس ہے اس لیے اس کی صفت جمع لائی گئی۔

1607 - مِحَالِ کا اصل مَحَلَ سے ہے اور اس کے معنی عقوبت کا وارد کرنا ہیں اور بعض کے نزدیک مِحَالَ کا اصل حَوْلَ بمعنی قوت سے ہے۔ (غ)

چونکہ اس رکوع کا مضمون بھی صداقت وحی ہے اور **قرآن کریم میں وحی کی مثال بارش سے دی ہے** ﴿ اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ﴾ [البقرة: 19:2] ''یا جیسے مینہ (جو) بادل سے (برسا) اس میں اندھیرا اور کڑک اور بجلی ہے۔'' اسی مناسبت سے یہاں بارش اور بادل اور رعد اور برق کا ذکر کیا ہے اور آگے [آیت: 17] میں اس کی اور وضاحت کردی ہے۔ وحی الٰہی کو نزول باران سے یہ مشابہت دی ہے کہ جس طرح بارش سے زمین کی مخفی طاقتیں کام کرنے لگ جاتی ہیں وحی الٰہی سے بھی انسانوں کی مخفی طاقتیں کام کرنے لگ جاتی ہیں اور ایک مردہ قوم میں زندگی پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی کچھ مشکلات

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

اسی کا حق ہے کہ اسے پکارا جائے اور وہ جنہیں وہ اس کے سوائے پکارتے ہیں وہ ان کی دعا کو قبول نہیں کرتے۔ مگر اس شخص کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلاتا ہے تاکہ وہ اس کے منہ تک آ پہنچے اور وہ اس تک پہنچنے والا نہیں اور کافروں کی دعا ضائع ہی ہوتی ہے۔ (1608)

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ السجدة 2

اور جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں چار و ناچار اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور ان کے سائے بھی صبح اور شام (سجدہ کرتے ہیں)۔ (1609)

بھی ہوتی ہیں۔ اور صاعقہ کے بھیجنے سے مراد یہ ہے کہ کچھ لوگ بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس باران رحمت سے فائدہ اٹھائیں، الٹا جھگڑا کر کے اس کے تباہ کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر کچھ عذاب بھی آتا ہے مگر آخری نتیجہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد ہے۔ دکھ اور تکلیف کی بھی یہی غرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح ہو۔

1608 - ﴿لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی جاتی ہے وہ برمحل ہے اور قبول ہوتی ہے یا اس کا فائدہ پہنچتا ہے اور اس دعوت یا دعا سے مراد یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہے۔ مضمون یہاں بھی وہی ہے جو پیچھے چلا آتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کر کے انسان فائدہ اٹھاتا ہے مگر یہاں اسے توحید کی طرف منتقل کر کے بتایا کہ **اللہ تعالیٰ کے سوائے جو اور بتوں وغیرہ سے تعلق پیدا کیا جاتا ہے تو اس کا نتیجہ کچھ نہیں ہوتا۔** اس کی مثال یہ دی ہے کہ ایک پیاسا آدمی ہاتھ پھیلا کر پانی سے آرزو کرتا ہے کہ وہ خود چل کر اس کے منہ تک پہنچ جائے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ قوتیں دی ہیں کہ وہ ان سب چیزوں کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے اور وہ اس کی خادم ہیں۔ مگر غلط کار انسان انہیں اپنا مخدوم بنا لیتا ہے اور اپنی پیدائش اور ان چیزوں کی پیدائش کی علت غائی کو بھی باطل کرتا ہے۔ ﴿دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ﴾ سے مراد یہاں وہی دعا ہے جو وہ اپنے بتوں وغیرہ کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس کو پکارتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو بھی سن لیتا ہے ﴿دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ﴾ [یونس: 10:22-23] ''اللہ کو پکارتے ہیں خالص فرمانبرداری کرتے ہوئے۔ اگر تو ہمیں اس سے نجات بخشے، تو یقیناً ہم شکرگزاروں میں سے ہوں گے۔ پھر جب انہیں نجات دیتا ہے۔''

1609 - ﴿طَوْعًا وَّ كَرْهًا﴾ طَوْعَ انقیاد یعنی فرمانبرداری ہے اور کَرْہَ اس کی ضد ہے اور ﴿طَوْعًا وَّ كَرْهًا﴾ سے مراد ہے کہ بہرحال اس کی فرمانبرداری کرتے ہیں جو برضا و رغبت فرمانبرداری نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا نہیں کرتے وہ اس کا نتیجہ کسی اور

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ

کہہ کون آسمان اور زمین کا رب ہے؟ کہہ دے اللہ، کہہ تو کیا تم اس کے سوائے حمایتی بناتے ہو جو اپنے بھلے برے کے مالک نہیں۔ کہہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں یا کیا اندھیرا اور روشنی برابر ہیں یا کیا انہوں نے اللہ کے کوئی ایسے شریک بنائے ہیں جنہوں نے (کچھ) پیدا کیا ہو جیسے اللہ پیدا کرتا ہے۔ پھر پیدائش ان کی نظر میں مل جل گئی۔ کہہ دے اللہ ہی

رنگ میں بھگتتے ہیں اور اسی کو کَرْھًا فرمانبرداری کہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے قانون میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر قانون کو نہ مانیں اور اس کو توڑ دیں تو پھر آخر اس کی سزا اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ بھی آخر کار سجدہ ہی ہے گو نقصان کے رنگ میں۔ اور ﴿مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ سے مراد یا ملائکہ اور جن وانس ہیں اور یا سب مخلوق اس میں شامل ہے۔

ظلال یا سائیوں کے سجدہ سے کیا مراد ہے۔ اس کی تصریح خود قرآن شریف نے دوسری جگہ کر دی ہے ﴿اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ ۝﴾ [النحل: 48:16] ''کیا وہ ہر اس چیز کو نہیں دیکھتے جو اللہ نے پیدا کی ہے۔ اس کے سائے بھی دائیں اور بائیں ڈھلتے ہیں اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے قانون کے ماتحت چلتے ہیں۔ تو انسان اس قانون سے باہر کیونکر نکل سکتا ہے جب اس کا سایہ تک بھی قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ مگر آیا ظل یا سایہ سے مراد صرف انسان کا وہ سایہ ہے جو سورج کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ظل عربی زبان میں بہت وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی پردہ اور سواد اور کسی چیز کا اپنا وجود بھی مراد لے لیا جاتا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں آتا ہے [إِنَّ الْكَافِرَ يَسْجُدُ لِغَيْرِ اللهِ وَ ظِلُّهُ يَسْجُدُ لِلّٰهِ] (الهداية الى بلوغ النهاية، باب48، جلد6، صفحہ4007) جہاں ظِلّ کے معنی اس کا جسم لیے گئے ہیں جس سے سایہ پیدا ہوتا ہے۔ (ن) اور [ظِلَالُ الْبَحْرِ] سے مراد اس کی موجیں لی گئی ہیں۔ (ل) اور ظِلّ کے معنی خیال بھی آئے ہیں۔ (ل) اور ظل کے معنی حالت بھی ہیں [اِنْتَقَلَتْ عَنْ ظِلِّي] یعنی میں اپنی حالت سے الگ ہو گیا۔ (ت)

اور ظل کا لفظ دو حدیثوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے ایک میں ہے [سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللهُ فِي ظِلِّهِ] (صحيح بخاری، كتاب الاذان، باب مَنْ جَلَسَ فِي الْمَسْجِدِ يَنْتَظِرُ الصَّلاَةَ ، وَفَضْلِ الْمَسَاجِدِ ، حديث: 660) جہاں اللہ کے ظلّ سے مراد اس

كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿١٦﴾ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ اکیلا ہے سب پر غالب۔ (1610)

کی رحمت لی گئی ہے اور [السُّلْطَانَ ظِلُّ اللهِ فِي الْأَرْضِ] (شعب الإيمان، جلد9، صفحہ475، حدیث: 6984) جہاں [ظِلُّ الله] کے معنی [سِتْرُ اللهِ] یا [خَاصَةُ اللهِ] لیے گئے ہیں۔ (ن۔ت) اور دونوں حدیثوں سے ظاہر ہے کہ ظل سے مراد اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا ظہور لیا گیا ہے۔ جس طرح سایہ کسی شخص کا ظہور ہوتا ہے۔ پس ظلال کے ظاہر معنی لیتے ہوئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان خود تو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری چار و ناچار اختیار کرتا ہی ہے مگر اس کی صفات کا جو ظہور اعمال کے رنگ میں ہوتا ہے جسے انسان کا ظل کہنا چاہیے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے قوانین کے ماتحت اور اس کا فرمانبردار ہے۔ یعنی انسان جیسا بھی چاہے عمل کرے وہ گویا اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرے مگر وہ جو بھی عمل کرتا ہے چونکہ اس پر نتیجہ پھر اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق مترتب ہوتا ہے اس لیے وہ اس کا ظل یا عمل یا اس کی صفات کا ظہور اللہ تعالیٰ کو ہی سجدہ کرتا ہے اور ظل بمعنی حالت اوپر بیان ہو چکا۔ یہ معنی اس کے مطابق ہیں اور میرے نزدیک سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کے جو اوپر نقل ہو چکی [إِنَّ الْكَافِرَ يَسْجُدُ لِغَيْرِ اللهِ وَ ظِلُّه يَسْجُدُ لِلّٰهِ] کے یہی معنی ہیں اور یہی معنی ظلال کے [الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوفِ] (صحيح بخاری، كتاب الجهاد، باب الْجَنَّةُ تَحْتَ بَارِقَةِ السُّيُوفِ، حديث: 2818) میں ہیں یعنی تلوار سے جو جہاد فی سبیل اللہ کیا جاتا ہے اس سے جنت حاصل ہوتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ صوفی جسے ظلی نبوت کہتے ہیں وہ فی الواقع نبوت نہیں بلکہ نبوت کی بعض صفات کی جھلک ہے، جو ایک سچے پیروی کرنے والے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح [ظِلُّ الله] اللہ نہیں اسی طرح ظل نبی نبی نہیں اور نہ ظلی نبوت نبوت ہے۔ اللہ اور نبی کے ظل ایسے ہی ہیں جیسے صاف پانی یا آئینہ میں آفتاب کا عکس کہ وہ آفتاب کی شکل پر نظر آتا ہے مگر فی الحقیقۃ آفتاب نہیں۔

1610 - **غیر اللہ سے تعلق بے سود ہے:** توحید کے مضمون کو جاری رکھا ہے تاکہ لوگ صرف ایک اللہ سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کریں جس سے انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ایک انسان کو خدا سمجھ کر یا خدائی کا مرتبہ دے کر یا کسی اور چیز کو اپنا معبود بنا کر اور اس سے تعلق پیدا کر کے انسان کو حقیقتاً کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے کہ یہ چیزیں تو خود اپنی ذات کے لیے بھی نفع نقصان کی مالک نہیں۔ اعمیٰ وہ جاہل ہے جو غیر اللہ سے تعلق پیدا کرتا ہے اور بصیر مومن ہے۔ ظلمات سے مراد کفر اور ضلالت ہیں اور نور سے ایمان۔ آیت کے آخری حصہ میں خلق کو دلیل عبادت قرار دے کر جیسا کہ بارہا پہلے بھی بیان ہو چکا ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ [البقرة: 21:2] ''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور انہیں جو تم سے پہلے تھے۔'' فرمایا کہ جن کو معبود بناتے ہو کیا ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اس نے کچھ پیدا کیا ہو۔ ﴿خَلَقُوْا

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ﴿۱۷﴾

وہ بادل سے پانی اتارتا ہے پھر نالے اپنے اپنے اندازے کے موافق بہہ نکلتے ہیں۔ پس سیلاب جھاگ کو اوپر اٹھا دیتا ہے اور اس میں جسے آگ میں تپاتے ہو، زیور یا اور سامان بنانے کے لیے اسی طرح جھاگ ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال دیتا ہے۔ سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے اور وہ (پانی) جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔ اسی طرح اللہ مثالیں بیان کرتا ہے۔ (1611)

﴿كَخَلْقِهٖ﴾ کی شرط اس لیے لگائی کہ انسان بھی تو دن رات چیزیں بناتے رہتے ہیں اور خلق بمعنی اندازہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر کیا اللہ تعالیٰ کی مخلوق جیسی بھی وہ کوئی چیز پیدا کر سکتے ہیں۔ ایک چیونٹی کیا ایک چیونٹی کا پاؤں بھی نہیں بنا سکتے۔ مسیح کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا گیا ہے۔ جو مسلمان یہ مانتا ہے کہ آپ نے چمگادڑ بنائے تھے جو خدا کی مخلوق جیسی مخلوق ہے یا کوئی اور پرند بنائے تھے جو خدا کی مخلوق سے مل گئے ہیں وہ عیسائیوں کے ہاتھ میں مسیح کی خدائی کی ایک دلیل دیتا ہے۔

1611 - ﴿زَبَدًا رَّابِيًا﴾ زَبَد کے معنی جھاگ ہیں۔ رابیًا۔ رَبَا سے ہے جس کے معنی ہیں بڑھا پا اور اوپر آ گیا اور یہاں ﴿زَبَدًا رَّابِيًا﴾ سے مراد ہے جھاگ جو اوپر آ جاتی ہے اور ﴿اَخْذَةً رَّابِيَةً﴾ [الحاقة: 10:69] کے معنی ہیں شدت سے بڑھی ہوئی گرفت۔

حِلْيَةٍ - زیور ﴿اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ﴾ [الزخرف: 18:43] ''کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔'' جمع حُلِیّ ہے۔ ﴿مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا﴾ [الأعراف: 148:7] ''اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنا لیا۔''

جُفَآءً۔ [اَجْفَاتِ الْقِدْرِ] کے معنی ہیں ہانڈی نے (جھاگ کو) باہر پھینک دیا اور جُفَاءٌ وہ چیز ہے جو وادی باہر پھینک دیتی ہے یعنی ردّی چیز۔ (غ)

اس مثال کو اللہ تعالیٰ نے خود ہی واضح کر دیا کہ یہ حق اور باطل کی مثال ہے۔ باطل ایک وقت اوپر نظر آتا ہے مگر وہ جھاگ کی طرح ہوتا ہے اور حق اسی پانی کی طرح ہے جو لوگوں کو نفع دیتا ہے۔ بِقَدَرِهَا میں یہ بتا دیا کہ جس طرح وادی اپنے قدر کے مطابق بارش کے پانی کو لیتی ہے اسی طرح ہر انسان اپنی استعداد کے مطابق وحی الٰہی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ آج بھی باطل جھاگ کی طرح اوپر آیا ہوا ہے یہ جھاگ جاتا رہے گا اور حق رہ جائے گا۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؕ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ۬ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾

جنہوں نے اپنے رب کی بات مانی ان کے لیے بھلائی ہے اور جو اس کی بات نہیں مانتے اگر ان کے لیے وہ سب کچھ بھی ہو جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی تو وہ سب اپنے چھڑانے کو دے دیں ان کے لیے برا حساب ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ (1612)

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۙ﴿۱۹﴾

بھلا کیا وہ جانتا ہے کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تیری طرف اتارا گیا ہے سچ ہے۔ اس جیسا ہے جو اندھا ہے، عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ (1613)

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۙ﴿۲۰﴾

جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اقرار کو نہیں توڑتے۔

وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ؕ﴿۲۱﴾

اور جو اسے جوڑتے ہیں جو اللہ نے حکم دیا ہے کہ جوڑا جائے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب کا خوف رکھتے ہیں۔

وَ الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا

اور جو اپنے رب کی رضا چاہتے ہوئے صبر کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور اس میں سے جو ہم نے دیا ہے چھپ کر

1612 - آخری آیت میں پھر تعلق باللہ کی طرف توجہ دلائی کہ اس کا نتیجہ بہتری ہے اور وہ بہتری جو اس ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے وہ دنیا کے سارے مال و دولت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ دنیا کا سارا مال بھی اکٹھا کیا جائے تو اخلاق فاضلہ کو پیدا نہیں کر سکتا۔

1613 - جب پہلے دو رکوعوں میں یہ بیان کر دیا کہ وحی الٰہی انسان کے اخلاق پر اور اس کی روحانیت پر کیا اثر پیدا کرتی ہے تو اب مومن اور کافر کا اور ان کے انجام کا مقابلہ کیا ہے۔

وَّ عَلَانِيَةً وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾

اور ظاہر خرچ کرتے ہیں اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں انہی کے لیے (اس) گھر کا انجام اچھا ہے۔ (1614)

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾

ہمیشگی کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور (وہ بھی) جو ان کے ماں باپ سے اور ان کی بیویوں اور اولاد میں سے نیک ہوں اور فرشتے ان پر ہر دروازے سے داخل ہوں گے۔ (1615)

1614 - ﴿عُقْبَى الدَّارِ﴾ عُقُوْبَةٌ اور مُعَاقَبَةٌ اور عِقَابٌ تینوں لفظ عذاب یا سزا سے مختص ہیں گو اصل تینوں کے معنی میں انجام یا پیچھے لانا ہے اور عُقَبٌ اور عُقْبٰی اور عَاقِبَةٌ یہ تینوں لفظ ثواب سے خاص ہیں یعنی جہاں اچھا بدلہ یا اچھا انجام بتانا مراد ہو وہاں ان لفظوں کا استعمال ہوتا ہے۔ ﴿خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا﴾ [الكهف: 44:18] ''بدلا دینے میں اچھا اور اچھا انجام لانے میں بہتر ہے۔'' ﴿وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ [القصص: 83:28] ''اور عاقبت متقیوں کے لیے ہے۔'' پس عُقْبٰی سے مراد ثواب یا اچھا انجام اور ﴿تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۪ وَّ عُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ۝﴾ [35] میں کافروں کے لیے عقبیٰ کا لفظ صرف مقابلہ کے طور پر اختیار کیا ہے اور شاید اس لیے بھی کہ پھر آگ سے ہی ان کی اصلاح ہوگی اور الدار سے مراد یہ دار دنیا ہے یعنی جو دنیا میں رہ کر یہ کام کرتے ہیں ان کے لیے اس گھر کا انجام بھی اچھا ہوتا ہے۔ اس کی تصریح اگلی آیت میں ہے۔ اس گھر کے انجام کو ﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ﴾ کہنے میں اشارہ ہے کہ وہ اس دنیا میں ہی جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ان تین آیتوں میں مومنوں کے اوصاف بیان کیے۔ سب سے آخر میں فرمایا کہ وہ **برائی کو بھلائی سے دور کر دیتے ہیں**۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو برائی کرتا ہے ضرور اس سے بھلائی کرتے ہیں۔ کیونکہ بعض وقت برائی کی سزا دینی پڑتی ہے اور برائی کا ذکر کرنے والے کو تکلیف پہنچانی ضروری ہوتی ہے۔ یہ ناقص تعلیم انجیل کی مشہور پہاڑی وعظ میں ہے جو ایک وقتی تعلیم تھی۔ مگر جس پر دنیا ہمیشہ کے لیے کبھی بھی عامل نہیں ہو سکتی۔ ہر طمانچہ مارنے والا ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے آگے دوسری گال کر دی جائے۔ اس لیے اس کامل تعلیم میں یہ ہدایت فرمائی کہ بدی کو دور کرنا اصل غرض ہونی چاہیے۔ ہاں اسے بھلائی سے دور کرو۔ اس میں یہ بات بھی آ گئی کہ تم سے کوئی برائی کرے تو تم اس سے نیکی کرو اور یہ بھی کہ بدی کا دور کرنا اصل غرض سمجھو۔ پس جہاں نیکی کرنے سے برائی دور نہیں ہوتی تو اچھے طریق سے اسے دور کرو۔ اور یہ بھی اس میں آ جاتا ہے کہ اپنی طاقتوں کو نیکی پر لگا کر اپنی برائیوں کو دور کر دیتے ہیں۔

1615 - **عزیزوں کا جنت میں انسان کے ساتھ ہونا:** ماں باپ اور بیبیوں اور اولاد کا ذکر اس لیے کیا کہ ان سے ہی انسان کی

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

تم پر سلامتی ہو اس لیے کہ تم نے صبر کیا سو کیا ہی اچھا (اس) گھر کا انجام ہے۔ (1616)

وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

اور وہ جو اللہ کے عہد کو اس کے پکا کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور اسے کاٹتے ہیں جو اللہ نے حکم دیا ہے کہ جوڑا جائے، اور زمین میں فساد کرتے ہیں یہی ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور جن کے لیے (اس) گھر کا برا (انجام) ہے۔ (1617)

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾ ع 3 8 9

اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے اور لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو جاتے ہیں حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں صرف عارضی سامان ہے۔ (1618)

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ

اور جنہوں نے کفر کیا کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے نشان کیوں نہیں اتار دیا جاتا۔ کہہ اللہ جسے

راحت کمال کو پہنچتی ہے اور گو وہ اس کمال کو نہ پہنچے ہوں مگر انہی جنات میں وہ بھی ہوں گے یعنی ان کے ساتھ ہوں گے۔ ہاں ﴿مَنْ صَلَحَ﴾ کی شرط لگا دی ہے کہ صلاحیت ان میں ہو اور اس لیے بھی یہ ذکر کیا ہے کہ جو لوگ ان اوصاف والے ہوتے ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ان کا نیک اثر ان کے ماں باپ بی بی اولاد پر بھی پڑتا ہے۔ اور فرشتوں کا ہر دروازہ سے داخل ہونا یہ ہے کہ جتنے اسباب نیکی کے ہوتے ہیں وہ ان سب سے بہرہ ور ہوتے ہیں [دیکھو نمبر: 240] اس لیے ملائکہ بھی ہر باب جنت سے ان پر داخل ہوتے ہیں۔

1616 - ابن جریر میں ہے کہ آنحضرت ﷺ اور سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما شہداء کی قبور پر جاتے تو یہ لفظ دہراتے تھے۔

1617 - یعنی اس دنیا کی زندگی میں رہ کر انہوں نے اپنے لیے بری کمائی کی اس لیے اس گھر کا انجام بھی ان کے لیے برا ہو۔

1618 - یہاں بتایا کہ رزق کی فراخی اور تنگی پر نہ جانا چاہیے یہ دنیا کے عارضی سامان ہیں۔ دونوں حالتوں میں رہ کر اللہ تعالیٰ سے تعلق

مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾

چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑتا ہے اور اسے اپنی طرف رستہ دکھاتا ہے جو (اس کی طرف) رجوع کرتا ہے۔ (1619)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

جو ایمان لاتے ہیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ سن رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔ (1620)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں ان کے لیے انجام کار خوشحالی اور اچھا ٹھکانا ہے۔ (1621)

پیدا کرنا چاہیے۔

1619 - اسی نشان ہلاکت کا مطالبہ پھر ہے جس کا مطالبہ [آیت: 7] میں تھا۔ انہیں مثالیں دے کر سمجھایا جاتا ہے کہ وحی الٰہی سے وہ اسی طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں جس طرح زمین بارش سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ مگر ان کا مطالبہ وہی ہے اس کا جواب اسی رکوع کی آخری آیت میں ہے کہ پہلے ان پر چھوٹی چھوٹی مصائب آتی رہیں گی یہاں تک کہ وہ نشان ہلاکت آ جائے۔

آیت کے پچھلے حصہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اسے وہ ضرور اپنی طرف رستہ دکھا دیتا ہے اور جو رجوع نہیں کرتا خود قدم نہیں اٹھاتا اللہ تعالیٰ اسے پکڑ کر نہیں لاتا۔ بلکہ جس طرح وہ خود گمراہی میں رہنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اسے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔

1620 - **اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اطمینان قلبی** میسر آتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے تمام پاک لوگوں کی زندگیاں روشن کرتی ہیں کہ کس طرح مصائب کے اندر، مشکلات کے اندر، ناکامیوں کے اندر، قید میں پڑ کر ان کے دلوں میں راحت ہوتی ہے اور اللہ کے ذکر کے سوائے اطمینان قلبی میسر نہیں آتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے جسے تمام طالبان دنیا کی زندگیاں اظہر من الشمس کرتی ہیں کہ کس طرح جب ملک پر ملک فتح ہوتا چلا جاتا ہے تو دل میں اور آگ بھڑکتی ہے اور جب خزانہ پر خزانہ حاصل ہوتا جاتا ہے تو ہوس دنیا کی آگ اور تیز ہوتی جاتی ہے۔ نہ فتوحات نے اور نہ مال دنیا نے کسی شخص کے دل میں اطمینان پیدا کیا ہے۔ اور چونکہ قلب انسانی کو جب تک اطمینان میسر نہیں آتا اس وقت تک وہ ترقی کے قابل بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کے وہ جوہر نشوونما پاتے ہیں جن کے لیے یہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ بتا کر کہ صرف اللہ کے ذکر سے ہی اطمینان قلب میسر آتا ہے توجہ دلائی ہے کہ قلب انسانی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کر کے ایک انقلاب عظیم پیدا ہوتا ہے۔

1621 - ﴿طُوْبٰى﴾۔ طَابَ سے مصدر ہے اور اس کے معنی میں مختلف روایات ہیں۔ خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک، خیر کثیر، کرامت

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ ۝۳۰

اسی طرح ہم نے تجھے ایک امت میں بھیجا ہے جس سے پہلے امتیں گزر چکیں تاکہ تو ان پر وہ پڑھے جو ہم نے تیری طرف وحی کی اور وہ رحمٰن کا انکار کرتے ہیں۔ کہہ وہ میرا رب ہے اس کے سوائے کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اس کی طرف میرا رجوع ہے۔ (1622)

وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ

اور اگر قرآن ایسا ہوتا جس سے پہاڑ دور کر دیئے جائیں یا اس سے زمین کاٹ دی جائے یا اس کے ذریعہ سے مُردوں سے باتیں کی جائیں بلکہ سب باتیں اللہ کے اختیار میں ہیں۔ (1623) تو کیا جو ایمان لاتے ہیں

وغیرہ۔ (ر) مفردات میں ہے کہ طوبیٰ کہا گیا ہے کہ جنت میں ایک درخت کا نام ہے اور ترجیح اس کو دی ہے کہ وہ جنت کی ہر ایک نعمت ہے جیسے بقا، جس کے ساتھ فنا نہیں۔ عزت جس کے ساتھ زوال نہیں۔ غنا جس میں فقر نہیں۔

1622 - مَتَابِ۔ اصل میں مَتَابِیْ ہے۔ میرا مَتَاب اور مَتَابِ کے معنی کامل توبہ ہیں۔ یعنی ہر ایک قبیح بات کا ترک کرنا اور ہر ایک جمیل کا اختیار کرنا۔ (غ)

ان دونوں باتوں کا کہ ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی جس طرح پہلے بھیجتے رہے اور یہ لوگ رحمٰن کا انکار کرتے ہیں یہ تعلق ہے کہ نزول وحی اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت سے ہے۔ جس طرح اس نے انسانوں کے لیے دوسرے سامان اپنی قدرت کاملہ سے مہیا کیے ہیں اسی طرح ابدی زندگی کے حصول کے لیے وحی کا سامان رکھا ہے ﴿ اَلرَّحْمٰنُ ۙ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝﴾ [الرحمٰن: 55:1-2] ''رحمٰن نے قرآن سکھایا'' جو لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں وہ اس ابدی زندگی کو حاصل کر لیں گے۔

1623 - جِبَالُ۔ جَبَلٌ کی جمع ہے یعنی پہاڑ مگر یہ لفظ عظیم الشان انسانوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ بعض وقت ثبات کے معنی کے لحاظ سے جو اس میں پایا جائے۔ (غ) اور فراء کا قول ہے: [اَلْجَبَلُ سَيِّدُ الْقَوْمِ وَ عَالِمُهُمْ] (ل) یعنی قوم کے سردار اور ان کے عالم کو جَبَل کہا جاتا ہے اور طاقتور آدمی کے لیے کہا جاتا ہے [فُلَانٌ جَبَلٌ مِّنَ الْجِبَالِ] (ل) وہ شخص پہاڑوں میں سے پہاڑ ہے۔

لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ لَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ

انہوں نے جان نہیں لیا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب ہی لوگوں کو ہدایت دیتا[1624] اور جنہوں نے کفر کیا انہیں اس کی وجہ سے جو وہ کرتے ہیں کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی یا ان کے گھر کے قریب اترے گی یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آ جائے

قرآن کے کمالات:

لَوْ کی جزا محذوف ہے ایسی صورتوں میں جواب اس لیے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی قرآن ایسا ہوسکتا ہے تو یہی ہے [لَكَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ] (ر) اور دوسری جگہ صفائی سے فرمایا ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ [الحشر: 21:59] ''اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو تُو اسے اللہ کے خوف سے گرا ہوا پھٹا ہوا دیکھتا۔'' بلکہ ﴿لِلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا﴾ کہہ کر صاف بھی کر دیا کہ یہ سب باتیں اسی قرآن سے ہو جائیں گی۔ پہاڑوں کے دور کر دینے یا اپنی جگہ سے ہٹا دینے سے مراد ان عظیم الشان آدمیوں کا دور کر دینا ہے جو اس کی راہ میں روک ہو رہے تھے۔ جیسا کہ لفظ جبل کی لغوی تشریح سے ظاہر ہے۔ زمین کے کاٹنے سے مراد اس میں نہروں اور چشموں کا چلانا ہے۔ (ر۔ج) اور مجازاً مراد علوم روحانی کی نہریں اور چشمے ہیں۔ جیسا کہ اسی سورت میں وادیوں کے بقدر استعداد پانی کے لینے سے یہی مراد ہے۔ [دیکھو نمبر: 1611] اور مردوں کے کلام سے مراد روحانی مردوں کا زندہ ہونا ہے جیسا کہ خود دوسری جگہ قرآن شریف نے فرمایا ﴿اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ﴾ [الأنعام: 122:6] ''اور کیا وہ جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا۔'' اور ﴿اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ﴾ [الانفال: 24:8] ''تم کو اس کام کے لیے بلاتا ہے جو تمہیں زندگی دیتا ہے۔'' اور بَلْ کا یہاں لانا اسی لیے ہے کہ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ ایسا کہاں ہوسکتا ہے تو یاد رکھو کہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اور ہو کر رہیں گی۔ گویا پہلے [آیت نمبر: 28] میں یہ بتایا کہ اس قرآن کے ذریعہ سے قلوب انسانی میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگا تو اس کے بعد اب بتایا کہ یہ انقلاب دلوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ظاہر میں بھی اور کھلے رنگ میں یہ ایک انقلاب عظیم پیدا کر کے دکھائے گا۔

1624- ﴿يَايْـَٔسِ﴾ کے معنی یہاں يَعْلَمُ کیے گئے ہیں۔ بعض نے کہا یہ معنی لغت ہوازن میں ہیں۔ (ر) اور بعض کے نزدیک یہ مجاز ہے کیونکہ مایوس ہونے والوں کو یہ علم ہوتا ہے کہ یہ بات نہیں ہوگی۔ (ر) اور مفردات میں ہے کہ مومنوں کی اس سے یاس اس بات کی مقتضی تھی کہ اس کے نہ ہونے کے علم کے بعد حاصل ہو۔ اس لیے ان کی یاس کا قائم ہونا ان کے حصول علم کے قیام کا مقتضی ہوا۔

یہاں بھی اسی کے مطابق خوشخبری ہے جو پہلے حصہ آیت میں تھی کہ یہ سب رکاوٹیں دور ہو کر مردے بولنے لگیں گے۔ کیونکہ یہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو سب لوگوں کو ہدایت دے دے۔

ع 4 5 10 اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾

اللہ وعدے کا خلاف نہیں کرتا۔ (1625)

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

اور تجھ سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ ہنسی کی جاتی رہی۔ سو میں نے کافروں کو مہلت دی، پھر انہیں پکڑا۔ سو میری سزا کیسی تھی۔ (1626)

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَ صُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

پھر کیا وہ جو ہر شخص پر اس کا کیا لیے کھڑا ہے (انہیں سزا نہ دے گا) اور انہوں نے اللہ کے شریک بنا رکھے ہیں، کہہ ان کے نام لو آیا تم اللہ کو جتاتے ہو جو زمین میں ہے وہ نہیں جانتا، یا سرسری بات کر دیتے ہو (جس کی کوئی حقیقت نہیں) بلکہ جو کافر ہیں انہیں اپنی چال اچھی معلوم ہوتی ہے اور وہ رستے سے رک گئے ہیں اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔ (1627)

1625 - ﴿قَارِعَةٌ﴾۔ قَرعٌ کے معنی ایک چیز کا دوسری پر مارنا ہیں اور قَارِعَةٌ مصیبت کو کہا جاتا ہے یا سخت مصیبت کو اور یہاں قَارِعَةٌ کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کا کوئی سریہ ہے۔ (ل) اور قیامت کو بھی ﴿اَلْقَارِعَةُ﴾ کہا ہے۔
یہ کفار کے مطالبہ نشان کا جواب ہے جو دو دفعہ آ چکا ہے اور اس لیے اس کی تفسیر میں یہی قول صحیح ہے کہ یہاں کفار سے مراد قریش اور عرب ہیں۔ اور **قَارِعَةٌ سے مراد جنگیں ہیں** اور ﴿وَعَدَ اللّٰهُ﴾ سے مراد اسلام کا آخری غلبہ اور اس کی حکومت ہے جو فتح مکہ سے قائم ہوئی اور ﴿قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ﴾ میں یہ اشارہ ہے کہ وہ مصائب خواہ خود ان مخالفین اسلام پر نازل ہوتی رہیں یا ان کے آس پاس نازل ہو کر ان کی تنبیہ کا موجب ہوتی رہیں اور تَحُلُّ میں خطاب رسول اللہ ﷺ کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی تو ان کے گھر کے قریب نازل ہو، جیسے حدیبیہ میں ہوا۔

1626 - یہاں **کافروں کے استہزا کا ذکر** اس لیے کیا کہ جب انہیں عذاب کا وعدہ دیا جاتا تھا تو وہ ہنسی کرتے تھے کہ یہ شخص جو کوئی طاقت نہیں رکھتا، کوئی اس کی بات نہیں سنتا اس کے سامنے ہم ذلیل اور مغلوب ہوں گے۔

1627 - ﴿اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ﴾ قَآئِمٌ کے معنی یہاں حافظ ہیں کیونکہ قیام بمعنی مراعاۃ بھی آتا ہے۔ (غ) مراد ایسا شاہد یا دیکھنے والا ہے جو

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

ان کے لیے دنیا کی زندگی میں عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی سخت ہے اور کوئی انہیں اللہ (کی سزا) سے بچانے والا نہیں۔

اس عمل کو محفوظ بھی رکھتا ہو یعنی اس پر جزا و سزا مترتب کرتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کو جو کچھ وہ کرتا ہے اس کی جزا یا سزا دیتا ہے کوئی عمل ضائع نہیں ہونے دیتا۔ یہ تو اللہ کی شان ہے اور انہوں نے اس کے شریک بنا رکھے ہیں۔

شرک کا ابطال:

بتانا یہ مقصود ہے کہ غور کرو کہ کیا وہ شریک بھی کچھ لوگوں کے اعمال کی جزا و سزا دیتے ہیں۔ کیا ان کو بھی تھوڑی بہت قدرت ہے کہ لوگوں کے اعمال کو دیکھیں۔ پھر ان پر جزا و سزا مترتب کریں۔ مفسرین نے اسے مبتدا قرار دے کر [كَمَنْ لَيْسَ كَذٰلِكَ] کو محذوف قرار دیا ہے یعنی کیا وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو ایسا نہیں اور ﴿قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ﴾ میں یہ بھی اشارہ ہے کہ تم جو تدبیریں ہمارے رسول کے خلاف کر رہے ہو ہم انہیں بھی محفوظ کر رہے ہیں۔ اسی کی وضاحت آیت کے آخر میں ﴿مَكْرُهُمْ﴾ میں موجود ہے۔

﴿سَمُّوْهُمْ﴾۔ سَمَّاهُ کے معنی ہیں اس کے لیے اسم یا علم قرار دیا۔ (ت) ﴿سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ﴾ [آل عمران: 36:3] ''اس کا نام مریم رکھا ہے۔'' میں مریم علم ہے اور اسم وہ ہے جس سے مسمی کا ذکر بلند ہوتا ہے اور وہ اس سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لیے ایک چیز کے وصف پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے ﴿لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى﴾ [النجم: 27:53] ''وہ فرشتوں کے نام عورتوں کے رکھتے ہیں۔'' میں مراد یہ نہیں کہ ملائکہ کے لیے کوئی علم تجویز کرتے ہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں یعنی ان کی صفت عورت ہونا بیان کرتے ہیں۔ ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾ [مریم: 65:19] ''کیا تو اس جیسا کوئی اور جانتا ہے۔'' میں سَمِیّ یا ہم نام سے مراد اس کی نظیر ہے یعنی ایسا موصوف جس پر اس کی صفات صادق آ سکیں اور ان صفات کا وہ مستحق ہو اور محض نام مراد نہیں کیونکہ نام تو اوروں کے بھی اللہ کے ناموں پر رکھ لیے جاتے تھے۔ ایسا ہی ﴿سَمُّوْهُمْ﴾ میں یہ مراد نہیں کہ ان کے نام کیا ہیں وہ بتاؤ۔ مثلاً لات یا عزیٰ۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ جن کو تم خدا کہتے ہو ان کے متعلق حق امر کو ظاہر کرو اور بتاؤ کہ ان اسماء کے معانی بھی ان میں پائے جاتے ہیں۔ (غ) اور بعض نے یوں معنی کیے ہیں کہ وہ تو ذکر کے قابل ہی چیزیں نہیں ہیں۔ (ر)

معبودانِ باطل:

﴿اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ایسے کوئی شرکاء نہیں تو تم شریک قرار دے کر اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو کہ جو اس کے علم میں نہیں اور ایسی چیز فی الحقیقت موجود نہیں ہو سکتی۔ اور ﴿بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ﴾ سے مراد باطل لیا گیا ہے۔ گویا ایسی بات جس کے نیچے حقیقت کوئی نہیں اور ایک معنی اس کے یہ بھی لیے گئے ہیں کہ کوئی

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۪ وَّ عُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

جنت کی مثال جس کا وعدہ متقیوں کو دیا گیا ہے (یہ ہے) اس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اس کے پھل ہمیشہ رہیں گے اور اس کی آسائش (بھی) یہ ان کا اچھا انجام ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور کافروں کا انجام آگ ہے۔ (1628)

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَ

اور وہ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور کچھ فرقے اس کی بعض (باتوں) کا انکار کرتے ہیں۔ کہہ مجھے صرف یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ شریک نہ کروں اسی کی طرف میں بلاتا ہوں

کتاب اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہو جس میں کھلے طور پر ان چیزوں کا نام خدا رکھا ہو۔ (ر) امور بلحاظ سیاق یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو خود ہر عمل پر قائم یعنی اس کا شاہد ہے تو تم اس کے ساتھ شریک ٹھہرا کر آیا اسے کچھ ایسی باتوں کی ان شریکوں کے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جن کو وہ نہیں جانتا یا کسی ظاہر بات کی خبر تم پہنچاتے ہو۔ یعنی تمہارا یہ خیال ہے کہ کچھ ایسے مخفی امور ہیں جن کا علم اللہ کو نہیں۔ ان شریکوں کے ذریعہ سے وہ علم اسے حاصل ہو جاتا ہے۔ یا یہ خیال کہ ظاہر اور کھلی کھلی باتوں کی اللہ تعالیٰ کو خبر نہیں ہوتی یہ باتیں ان شریکوں کے ذریعہ سے اس تک پہنچائی جاتی ہیں۔

1628 - مَثَلٌ۔ مَثَلٌ اور مِثْلٌ سے مراد بعض کے نزدیک کسی چیز کا وصف بھی ہوتا ہے اور یہ اس کی مثال دی ہے۔ (غ) اور اکثر مفسرین نے یہاں مراد [اَلصِّفَةُ الْغَرِيْبَةُ] لی ہے یعنی نادر صفت۔ مگر جب خود قرآن کریم اور حدیث صحیح نے بیان کر دیا کہ جنت کی نعماء ایسی چیزیں ہیں جنہیں آنکھوں نے نہیں دیکھا اور کانوں نے نہیں سنا اور دل میں نہیں گزریں تو لازماً ان کا ذکر اس دنیا کی چیزوں کے رنگ میں بطور مثال سمجھانے کے لیے ہے اور اسی لیے قرآن شریف نے ان کے لیے یہاں اور [سورہ محمد: 15:47] میں مَثَلٌ کا لفظ استعمال کیا ہے جو اپنے اصل معنی پر ہے۔ اور اس لفظ کے اختیار کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ یہ لازمی بات ہے کہ یہ نعماء کسی نہ کسی رنگ میں اس عالم میں بھی ان لوگوں کو ملیں جنہوں نے حق کو قبول کیا ہے مگر وہ نتائج عملی رنگ اختیار نہیں کرتے جب تک کہ قبولیت حق عمل میں نہ آئے۔ ظل کے معنی آسائش اس لحاظ سے کیے گئے ہیں کہ جنت کی شان ہے ﴿لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِيْرًا﴾ [الدھر: 13:76] ''نہ اس میں دھوپ (کی حدت) دیکھیں گے اور نہ سخت سردی۔'' ظل کے اس معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 676]۔

اِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾

اور اسی کی طرف میرا ٹھکانا ہے۔ (1629)

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ ع 5 6 11

اور اسی طرح ہم نے اسے اتارا فیصلہ عربی میں۔ اور اگر تو ان کی خواہشوں کی پیروی کرے اس کے بعد جو تیرے پاس علم آ گیا تو تیرے لیے اللہ کے مقابلہ پر کوئی حمایتی نہ ہوگا اور نہ کوئی بچانے والا۔ (1630)

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ؕ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

اور ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے اور انہیں بیویاں اور اولاد بھی دی اور کسی رسول کے لیے نہ تھا کہ سوائے اللہ کے حکم کے نشان لاتا۔ ہر میعاد کے لیے ایک حکم معین ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚۖ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔ (1631)

1629 - ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ﴾ سے مراد اصحاب نبی یا مومن ہیں اور احزاب سے مراد یہود و نصاریٰ۔ (ج) اور یہی سیاق چاہتا ہے۔

1630 - عَرَبِي سے مراد یہاں واضح لیا گیا ہے جس کے لیے [دیکھو نمبر: 1516]۔

1631 - كِتَابٌ۔ راغب کہتے ہیں کہ کتاب سے مراد کبھی وجود میں لانا اور فنا کرنا بھی ہوتا ہے اور یہی اس کی مثال دی ہے اور ﴿لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ﴾ کے معنی کیے ہیں کہ ہر وقت کے لیے اقتضائے حکمت سے کوئی چیز وجود میں لائی جاتی ہے اور کوئی فنا کی جاتی ہے اور یہی مطلب ﴿وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ کا ہے۔ اور یہ اس کے مطابق ہے جو فرمایا ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ [الرحمٰن: 29:55] ''ہر آن وہ ایک شان میں ہے۔''

پہلے کفار کے استہزا کا جواب دیا ہے کہ بیوی بچے ہونا خلاف رسالت کوئی امر نہیں۔ پہلے بھی رسولوں کی بیبیاں اور اولاد تھی۔ اس کے بعد اس نشان کا ذکر کیا ہے جس کا وہ بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ پہلے رسول بھی اپنے اختیار سے اپنے مخالفوں کو ہلاک نہ کرتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار کی بات ہے جب چاہے اور جس طرح چاہے کرے۔ اور پھر اپنا **عام قانون** بیان کیا کہ

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾

اور اگر ہم تجھے وہ بعض باتیں دکھا دیں جو ان سے وعدہ کرتے ہیں یا تجھے وفات دے دیں تو تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَ اللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَ هُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾

اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں اور اللہ فیصلہ کرتا ہے کوئی اس کے فیصلہ کو ردّ کرنے والا نہیں اور وہ جلد حساب لینے والا ہے۔ (1632)

ایک قوم کی جو اجل ہوتی ہے اس کے لیے بھی ایک مقرر وقت ہوتا ہے کہ کب اسے مٹایا جائے اور کب اس کی جگہ دوسری قوم کو کھڑا کیا جائے اور ﴿اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد لوح محفوظ کو بھی لیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا علم جس میں سب احکام اصل میں موجود ہوتے ہیں اور روح المعانی میں ایک روایت کی ذیل میں بیان کیا گیا ہے کہ ﴿اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد اصولی احکام ہیں جن میں کبھی نسخ نہیں ہوتا اور قرآن کریم میں دوسری جگہ یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے ﴿اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ [آل عمران: 7:3] ''محکم آیتیں ہیں جو کتاب کی اصل ہیں۔''

﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ﴾ سے اس بات پر بھی شہادت ملتی ہے کہ **اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنی قضا و قدر کو بھی ٹال دے** اور یہی حق ہے ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ﴾ [یوسف: 21:12] ''اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے۔'' میں اس طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں صاف فرما بھی دیا کہ بعض عذاب جن کا وعدہ دیا جاتا ہے ہم چاہیں تو دور بھی کر دیں اور عذاب کا وعدہ کر کے اس کا نہ لانا اللہ تعالیٰ کے وسیع عفو و کرم کا نتیجہ ہے جو انسان کے حیطہ خیال سے باہر ہے وہ کسی حالت میں بھی انسان کو مایوس نہیں ہونے دیتا۔

1632 - اَطْرَافَ۔ طَرَفٌ کی جمع ہے جس کے لیے [دیکھو نمبر: 513]۔ اور [طَرَفُ الْقَوْمِ] کے معنی ہیں ان کا رئیس اور اَطْرَافٌ کے معنی رؤسا۔ اس لیے یہاں اطراف کے گھٹانے سے مراد علما کی موت یا اس کے اہل کی موت اور پھلوں کی کمی لی گئی ہے اور [اَطْرَافُ الرِجَالِ] سے مراد اشراف بھی ہیں۔ (ل) اور مجاہد نے یہاں یہی معنی زمین کی اطراف کے گھٹانے کے لیے ہیں۔ (ج)

حق کے آخری غلبہ کا کھلا نشان اس کی قبولیت ہے:

جب نشان ہلاکت کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس کا لانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور پھر اس سے پچھلی آیت میں فرمایا کہ اگر محمد رسول اللہ ﷺ وفات بھی پا جائیں تو بھی حساب لینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے۔ تو اب انہیں یوں توجہ دلاتا ہے کہ وہ اگر غور کریں تو ان کی

وَ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَ سَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾

اور ان لوگوں نے بھی (حق کے خلاف) تدبیریں کیں جو ان سے پہلے تھے مگر سب تدبیر اللہ کے اختیار میں ہے وہ جانتا ہے جو ہر شخص کماتا ہے اور کافر جان لیں گے کہ اس گھر کا اچھا انجام کس کے لیے ہے۔ (1633)

آخری مغلوبیت کے نشان تو ابھی سے ظاہر ہو رہے ہیں کہ ہم زمین کے کناروں کو گھٹاتے چلے آتے ہیں یعنی ان کے بڑے بڑے آدمیوں کو کم کرتے چلے آتے ہیں اور دور دور اطراف عرب میں اسلام کا چرچا شروع ہو گیا ہے اور یہ کم کرنا صرف ان کی موت سے نہ تھا بلکہ ان کے مسلمان ہو جانے سے۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر اور عمر اور عثمان اور حمزہ رضی اللہ عنہم جیسے انسان اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور بعض مخالف مرتے بھی جاتے تھے۔ مگر عظیم ترین کامیابی اسلام کی جو اس زمانہ سے خاص تعلق رکھتی ہے مدینہ میں اسلام کا پھیل جانا اور بعض اور جوانب میں اس کی قبولیت کے آثار کا ظاہر ہونا ہے اور یہی ظاہر طور پر زمین کی اطراف کا گھٹتا چلا آنا تھا اور یہ اسلام کا اعجاز تھا کہ جس قدر اس کی مخالفت بڑھتی چلی جا رہی تھی اسی قدر دلوں پر اس کا اثر زیادہ ہوتا چلا جاتا تھا اور اسی قدر وہ اسباب پیدا ہوتے چلے جاتے تھے جن سے اس کا چرچا دور دور پھیلتا چلا جاتا تھا اور اگر مکہ میں اس کی ترقی رکتی معلوم ہوتی تھی تو عرب کے اور اطراف میں اس کا قدم آگے بڑھ رہا تھا اور دوسری جگہ فرمایا ﴿اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ [الأنبیآء: 44:21] ''تو پھر کیا غور نہیں کرتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں، تو کیا وہ غالب ہیں؟'' یعنی یہ زمین میں اسلام کی قبولیت کا پھیلتے جانا کفر کے غلبہ کا نشان نہیں بلکہ اس کی مغلوبیت کا نشان ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوا کہ یہاں بھی کفر کی آخری مغلوبیت کی طرف ہی توجہ دلائی ہے۔ تو سمجھایا کہ تمہیں آخری مغلوبیت تو اسی سے نظر آ جانی چاہیے کہ تمہارے بڑے بڑے آدمیوں کے دلوں پر اسلام تسلط کرتا چلا جا رہا ہے۔ درحقیقت حق کے آخری غلبہ کی اس سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ دشمنوں کے دلوں پر وہ اثر پیدا کر دیتا ہے۔ کاش آج بھی مسلمان دیکھتے کہ کس طرح اسلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کی صداقت یورپ کے دلوں کو کھاتی جا رہی ہے اور اس نشان سے سبق حاصل کر کے اپنا زور ان لوگوں کو مسلمان بنانے پر لگاتے اور مایوسی کو اپنے پاس نہ آنے دیتے۔ آخری الفاظ میں توجہ دلائی ہے کہ مخالف کی ناکامی کا فیصلہ اللہ کے ہاں ہو چکا ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے یعنی ان کی بدکاریوں اور شرارتوں کا اسی دنیا میں حساب لے لے گا۔

1633 - اس آیت میں کیسی صفائی سے بتایا کہ **ان کی تدابیر اور منصوبے جو اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف کر رہے ہیں ناکام ہوں گے**۔ ﴿فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا﴾ یعنی ان کی تدابیر کا کارگر یا ناکام ہونا اللہ کے اختیار میں ہے مگر ﴿يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ﴾ میں اپنا قانون بتایا کہ ایک کی ہلاکت اور دوسری قوم کا قیام ان کے اعمال کی وجہ سے ہے۔ کافر جان لیں گے کہ کامیاب کون ہوتا ہے۔ اس قسم کے الفاظ کو پڑھتے ہوئے ان حالات کو مدنظر رکھنا چاہیے جن میں یہ کہے گئے وہ وقت آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں پر سخت ترین مصائب کا تھا اور ہر طرف سے ناکامی ان کو گھیرے ہوئے معلوم ہوتی تھی۔ مکر کے

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾ ع 6 6 12

اور کافر کہتے ہیں تو بھیجا ہوا نہیں کہہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔ (1634)

لفظ میں یہ صاف اشارہ ہے کہ اس وقت آپ کے خلاف دشمنوں کے منصوبے ترقی پر تھے اور یہ ہجرت سے پہلے کا زمانہ ہے۔

1634 - **اہل عرب نے کیوں بالآخر اسلام کو قبول کیا:** اللہ کی گواہی عملی رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی پیشگوئیاں جو اس قدر صفائی سے ان کو سنائی جاتی تھیں جب اپنے وقت پر آ کر پوری ہوئیں تو سب عرب کی گردنیں اسلام کے سامنے جھک گئیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شہادت آنحضرت ﷺ کی سچائی پر تھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی شہادت انہی پیشگوئیوں میں مذکور تھی اس لیے ساتھ ان لوگوں کا نام بھی بڑھا دیا جن کے پاس کتاب یعنی قرآن کریم اور اس کی ان پیشگوئیوں کا علم تھا۔ ﴿مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾ سے یہی مراد ہے [اَیْ عِلْمُ الْقُرْاٰنَ] (ر) اور بعض نے پہلے کتابوں اور ان کی پیشگوئیوں کا علم بھی مراد لیا ہے۔

سورۃ ابراہیم

نام:

اس سورت کا نام ابراہیم ہے اور اس میں 7 رکوع اور 52 آیات ہیں۔ اس سورت میں اعدائے رسل کے رسولوں کو دکھ دینے اور گھروں سے نکالنے اور رسولوں کی آخری کامیابی کا عام ذکر ہے۔ مگر اس کے چھٹے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر ہے جو آپ نے مکہ اور اہل مکہ کے لیے کی تھی۔ اور جس دعا میں یہ ذکر ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ایک خاص غرض کے لیے خانہ کعبہ کے قریب ایک وادی غیر ذی ذرع میں چھوڑا گیا اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ان کا اس طرح چھوڑا جانا سلسلہ نبوت میں ایک پر حکمت فعل تھا۔ کیونکہ آخر اسی دور افتادہ شاخ سے اور اسے بے آب و گیاہ میدان سے توحید کا وہ چشمہ پھوٹنا تھا جس نے ساری دنیا کو سیراب کرنا تھا۔ اس لحاظ سے اس سورت کا نام ابراہیم رکھا گیا اور اس دعائے ابراہیمی کا یہ اثر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعدا کو ہلاک نہیں کیا گیا۔

خلاصہ مضمون:

اس سورت میں سب سے پہلے یہ بیان فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام دنیا کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کے لیے ہے

① اور پہلے ہی رکوع میں حضرت موسیٰ کے ساتھ مماثلت کا اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغام صرف اپنی قوم تک محدود تھا۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام محدود نہیں۔

② دوسرے رکوع میں مخالفین رسل کا ذکر ہے کہ وہ کس طرح رسولوں کے پیغام کو نہ صرف پس پشت ڈالتے ہیں بلکہ اس کی مخالفت پر سارا زور لگاتے ہیں۔

③ تیسرے میں بتایا ہے کہ جب ان کی مخالفت حد کو پہنچ جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس سرزمین سے بھی رسولوں کو نکال دیتے یا نکال دینے کا عزم کر لیتے ہیں تو آخر خدائی فیصلہ ہوتا ہے اور حق کامیاب اور باطل ناکام ہوتا ہے۔

④ چوتھے رکوع میں حق و باطل کا مقابلہ کر کے دکھایا ہے اور سمجھایا ہے کہ حق اس لیے کامیاب ہوتا ہے کہ اس کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور اس کے اصول و فروع ایک علم کی طرح ہوتے ہیں اسے کوئی چیز نابود نہیں کر سکتی۔

⑤ پانچویں رکوع میں بتایا کہ یہ حق جو وحی الٰہی کی صورت میں آسمان سے آتا ہے اس سے فائدہ نہ اٹھانا خود اپنے آپ کو ایک عظیم الشان نعمت الٰہی سے محروم کرنا ہے۔

⑥ چھٹے رکوع میں دعائے ابراہیم ہے اور بتایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ میں چھوڑنا خاص ارادۂ الٰہی کے ماتحت تھا۔ تاکہ سلسلہ نبوت اپنے کمال کو پہنچے۔

⑦ اور ساتویں رکوع میں رسول اللہ ﷺ کے مخالفین کی آخری مغلوبیت کا نقشہ کھینچا ہے۔

تعلق:

الٓرٰ کے مجموعہ میں یہ پانچویں سورت ہے اور اس میں ایک عمومیت کے رنگ میں رسولوں اور ان کے اعدا کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے سمجھایا ہے کہ حق ایک ایسی چیز ہے کہ وہ نابود ہو سکتی ہی نہیں۔ وہ ایک درخت ہے جس کی جڑ زمین میں مضبوط ہوتی ہے اور جس کی شاخیں آسمان میں پھیل کر چاروں طرف سے اپنی خوراک حاصل کرتی ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے تباہ نہیں کر سکتی اور باطل کی چونکہ جڑ کوئی نہیں ہوتی اس لیے دنیا کی کوئی طاقت اسے قائم نہیں رکھ سکتی۔ اس لیے رسول جو حق کو ساتھ لاتے ہیں انجام کار غالب ہی ہوتے ہیں۔

زمانۂ نزول:

اس سورت میں بھی کئی ایک صریح اشارات موجود ہیں کہ یہ مجموعہ مکہ کے آخری زمانہ کا ہے۔ یہاں نہایت صفائی سے ﴿لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ﴾ میں بتا دیا کہ کفار اب اپنی آخری تدبیر پر عزم کر رہے تھے اور ان کی اس عظیم الشان تدبیر کا ذکر یہاں ان الفاظ میں ہے ﴿وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝﴾[46] یہ وہی ان کی آخری چال تھی جس میں رسول اللہ ﷺ کا کام تمام کرنے کا فیصلہ وہ کرنے والے تھے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓرٰ ۟ قف كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۱﴾

میں اللہ دیکھنے والا ہوں۔ (یہ) کتاب (ہے) جو ہم نے تیری طرف اتاری تا کہ تو لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے اس کے رستہ کی طرف جو غالب تعریف کیا گیا ہے۔ (1635)

اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ وَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ﴿۲﴾

اللہ (کی طرف) جس کے لیے سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور کافروں پر سخت عذاب کی وجہ سے افسوس ہے۔

الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ

جو دنیا کی زندگی آخرت پر پسند کرتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور

1635 - ظُلُمٰتِ۔ ظُلْمَةٌ اور ظُلُمَاتٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 30] اور اس سے مراد جہالت، شرک، فسق کو لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ نور سے مراد انہی باتوں کی ضد ہوتی ہے۔ (غ) پس **ظلمات سے نور کی طرف لے جانے سے مراد** ہے کہ ہر قسم کی جہالت، توہمات اور فاسد اعتقادات سے نکال کر صحیح علم اور صحیح خیالات کی طرف لے جائے۔ یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ مذہب فی الحقیقت ایک علم ہے اور محض چند باتوں کے فرض کر لینے کا نام نہیں۔

قرآن شریف کے نازل کرنے کی غرض لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لانا ہے۔ بالفاظ دیگر توہم پرستی اور جہالت دور کر کے علم صحیح اور خیالات صحیحہ کا دنیا میں پھیلانا اور یہاں الناس کا لفظ لا کر اور [آیت: 5] میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کی یہی غرض قرار دے کر مگر قَوْمَكَ لفظ لا کر دونوں نبیوں کی مماثلت کو ظاہر کرتے ہوئے فرق بھی بتا دیا ہے کہ ایک کی غرض صرف اپنی قوم تک محدود تھی اور دوسرے کا پیغام تمام لوگوں کے لیے ہے۔ اور یہاں اس راہ کو عزیز وحمید کی راہ قرار دے کر بتا دیا کہ یہی صفات اس کے بندوں میں بھی پیدا ہو جائیں گی۔

يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝

اس میں ٹیڑھا پن ڈھونڈتے ہیں۔ یہی پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں۔ (1636)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان میں تاکہ انہیں کھول کر بتادے، پھر اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ رہنے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے، وہ غالب حکمت والا ہے۔ (1637)

1636 - ﴿يَسْتَحِبُّوْنَ﴾۔ حُبٌّ کے لیے [دیکھو نمبر: 203] اِسْتِحْبَابٌ یہ ہے کہ انسان کسی چیز کا قصد کرے کہ اس سے محبت کرے اور اس کا صلہ علیٰ لانے سے اس میں ایثار کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ (غ) یعنی ایک چیز کو دوسرے پر ترجیح دینا یا ایک سے بڑھ کر دوسری سے محبت کرنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا یا اس سے آخرت سے بڑھ کر محبت رکھنا کافروں کا کام ہے۔ اور اس کا نتیجہ وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ **آج مسلمانوں کی سب سے بڑی بیماری یہی دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا ہے۔** یعنی فوائد دنیوی کی فوائد دینی سے بڑھ کر پروا کرنا اور فوائد دنیوی کی خاطر فوائد دینی کو قربان کرنا۔ اسلام کی تعلیم یہ تھی کہ فوائد دینی کی خاطر فوائد دنیوی کو قربان کر دیا جاتا۔ مگر آج سب قومیں قومی فوائد کے لیے ایثار کرتی ہیں اور مسلمان سب سے پیچھے ہیں۔ اس لیے نفع بھی دوسری قومیں ہی اٹھاتی ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں قربانی کی روح پیدا نہیں کی جائے گی اس وقت تک ان میں زندگی کے آثار کبھی پیدا نہیں ہو سکتے۔

1637 - **آنحضرت ﷺ کی بعثت عامہ پر ایک اعتراض اور اس کا جواب:** عیسائی معترضین کہتے ہیں کہ یہاں جو اصول بیان کیا گیا ہے اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ صرف عرب کی طرف مبعوث ہوئے تھے کیونکہ آپ کی زبان عربی تھی اور اسے قطعی نتیجہ کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ فرمایا ہے کہ ہر ایک نبی اپنی قوم کی زبان میں ہی بھیجا جاتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ہر ایک نبی صرف اپنی ہی قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے اور یہ دو بالکل جدا باتیں ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی قوم عرب تھی مگر آپ کی بعثت عرب اور عجم دونوں کی طرف تھی۔ جیسا کہ قرآن کریم نے بار بار فرمایا ہے ﴿كَآفَّةً لِّلنَّاسِ﴾۔۔۔ بھیجا گیا اور جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آپ کی بعثت اسود اور احمر سب کی طرف تھی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ پہلے تمام انبیاء ایک ایک قوم کی طرف ہی بھیجے گئے جیسا کہ ہر نبی کا ذکر کر کے فرمایا کہ وہ ﴿اِلٰى قَوْمِهٖ﴾ بھیجا گیا یعنی اپنی قوم کی طرف یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ [آل عمران: 49:3] ''اور وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا'' مگر آنحضرت ﷺ کی نسبت کہیں نہیں فرمایا کہ آپ کو عرب کی طرف یا صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا بلکہ سب سے پہلی آیت میں ہی یہ فرق ظاہر کر دیا ہے [دیکھو نمبر: 1635]۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی قوم کو تیار کیا کہ وہ آپ کا پیغام تمام دنیا میں پہنچائے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیتوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال لا اور ان کو اللہ (کی نعمتوں) کے دن یاد دلا، یقیناً اس میں ہر ایک صبر کرنے والے شکر کرنے والے کے لیے نشان ہیں۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۶ ع 1 6 13

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کو کہا اللہ کی نعمت کو یاد کرو (جو) تم پر (ہوئی ہے) جب اس نے تمہیں فرعون کی قوم سے چھڑایا جو تمہیں سخت عذاب دیتے تھے اور تمہارے بیٹوں کو مار ڈالتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بھاری آزمائش تھی۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝۷

اور جب تمہارے رب نے بتا دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بھی سخت ہے۔ (1638)

وَ قَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۸

اور موسیٰ نے کہا اگر تم اور جو زمین میں ہیں سب کے سب انکار کرو تو اللہ یقیناً بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔ (1639)

1638 - یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک عام قانون بیان فرمایا ہے کہ **جب نعمت کے لیے انسان شکر کرتا ہے تو وہ اور زیادہ ملتی ہے** اور ناشکری کا نتیجہ دکھ ہے۔ شکر کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 75]۔ اور شکر نعمت عملی رنگ میں یہ ہے کہ حصول نعمت کے لیے جو اسباب اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں ان سے فائدہ اٹھائے۔ یہ قانون جسمانی اور روحانی دونوں نعمتوں پر یکساں حاوی ہے۔ زمین میں اللہ تعالیٰ نے طاقت رکھی ہے کہ وہ بیج کو نشوونما دے اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ زمین میں بیج ڈالا جائے۔ قلب انسانی میں طاقت رکھی ہے کہ وحی الٰہی کے اثر سے اس کی مخفی قوتیں بڑھیں اس نعمت کا شکر اس وحی کی قبولیت ہے جو اس طرح پر قدر کرتا ہے وہ فائدہ اٹھاتا ہے جو نہیں کرتا اس کا انجام محرومی اور دکھ ہے۔

1639 - مطلب یہ ہے کہ کفر (انکار یا ناشکری) سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ کسی کے شکر کرنے سے یا ایمان لانے سے اللہ تعالیٰ کو

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۛ وَ الَّذِيْنَ مِنْۢ
بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ
جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا
اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا
بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا
تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝۹

کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے (یعنی) نوح کی قوم اور عاد اور ثمود کی۔ اور ان کی جو ان کے پیچھے ہوئے۔ انہیں اللہ کے سوائے کوئی نہیں جانتا ان کے رسول کھلی دلائل لے کر آئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں ڈالے اور کہا ہم اس کا انکار کرتے ہیں جو تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے اور یقیناً ہمیں اس کے بارے میں سخت شک ہے جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو۔ (1640)

الثلثة

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ
مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى ؕ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ
تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ

ان کے رسولوں نے کہا کیا اللہ میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے وہ تمہیں بلاتا ہے تاکہ تمہارے قصور تمہیں بخش دے اور تمہیں ایک مقرر وقت تک مہلت دے۔ انہوں نے کہا تم بھی ہمارے جیسے انسان ہو۔ تم چاہتے ہو کہ ہمیں اس سے روک دو جس کی

فائدہ نہیں پہنچتا اور نہ ناشکری یا کفر سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ اس لیے کہ وہ غنی ہے یعنی اسے کسی کی احتیاج نہیں۔ اور اس کی حمد میں بھی اس سے فرق نہیں آتا۔

1640 - ﴿فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ﴾ اس کے معنی تین طرح پر ہو سکتے ہیں منکروں نے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں ڈالے گویا غیظ وغضب سے اپنے ہاتھ کاٹے جیسا کہ دوسری جگہ ہے ﴿عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ﴾ [آل عمران: 119:3] ''تو سخت غصے کے مارے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں۔'' یا اپنے ہاتھ اپنے مونہوں پر رکھے گویا خاموشی کی طرف اشارہ ہے یا اپنے ہاتھ نبیوں کے منہ میں ڈالے گویا انہیں خاموش کرا دیا۔ اور ردّ کا استعمال یہ ظاہر کرنے کو ہے کہ وہ بار بار ایسا کرتے رہے۔ (غ)

یہاں بیان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے لوٹا کر عام کر دیا ہے اور پھر فرمایا کہ اتنی قومیں ہوئیں ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا گویا ان کی تاریخ بھی محفوظ نہیں رہی۔ انہی الفاظ کی بنا پر سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نساب یعنی وہ لوگ جو سلسلہ نسب حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچا کر بس کرتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں۔ مگر ہمارے تاریخ نویسوں نے بعض حالات میں نسابوں کے بھی کان کتر دیئے ہیں۔

اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۰

ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے تو ہمارے سامنے کوئی کھلی سند لاؤ۔ (1641)

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱

ان کے رسولوں نے انہیں کہا کہ ہم تمہارے جیسے ہی انسان ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے اور یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم تمہارے پاس سوائے اللہ کے حکم کے کوئی سند لائیں اور چاہیے کہ مومن اللہ ہی پر بھروسا کریں۔

وَ مَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۱۲ ع 2 6 14

اور کیوں کر ہوسکتا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسا نہ کریں اور اسی نے ہمیں ہمارے رستوں کی ہدایت کی ہے اور ضرور ہم اس پر صبر کریں گے جو تم ہمیں ایذا دیتے ہو اور چاہیے کہ بھروسا کرنے والے اللہ پر ہی بھروسا کریں۔ (1642)

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۳ ۙ

اور جو کافر تھے انہوں نے اپنے رسولوں سے کہا ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے یا تمہیں ہمارے مذہب میں آ جانا ہوگا۔ سو ان کے رب نے ان کی طرف وحی کی کہ ہم یقیناً ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔

1641 - سُلْطٰن کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 537]۔ پہلی آیت میں رسولوں کا بینات یعنی کھلی دلائل کے ساتھ آنا بیان کیا تھا یہاں وہ سلطان کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حق کے غالب ہو جانے کا مطالبہ کرتے ہیں جیسا کہ انہیں کہا جاتا تھا۔

1642 - جو کچھ یہاں عام رسولوں کے متعلق بیان کیا گیا ہے اس سب میں ذکر آنحضرت ﷺ کا ہی اصل مقصود ہے۔

وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَ خَافَ وَعِیْدِ ﴿۱۴﴾

اور یقیناً ہم ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے۔ یہ اس کے لیے ہے جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے اور میرے (عذاب کے) وعدے سے ڈرتا ہے۔ (1643)

وَ اسْتَفْتَحُوْا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۱۵﴾

اور انہوں نے فیصلہ چاہا اور ہر ایک سرکش باغی نامراد ہوا۔ (1644)

1643 - مَقَامِیْ۔ میرا مقام اور مقام مصدر بمعنی قیام بھی ہوسکتا ہے اور اسم مکان یا زمان بھی یعنی کھڑا ہونے کی جگہ یا وقت۔ (غ) پس یہاں مقامی کے معنی میرا قیام یعنی میرا حفظ اعمال کے ساتھ قائم ہونا بھی ہوسکتے ہیں۔ یا میرا عدل وانصاف پر قائم ہونا۔ اور اس کے معنی میرا موقف یعنی میرے حضور سب انسانوں کے کھڑا ہونے کی جگہ بھی ہوسکتے ہیں۔

اخراج رسل اور ان کی آخری کامیابی:

سب رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قانون ایک ہی رہا ہے۔ آخری کامیابی سب کو ملتی ہے مگر اس زمانہ سے بھی سب کو گزرنا پڑتا ہے جب باطل فوجیں پورے زور پر ہوتی ہیں۔ اس وقت رسولوں کو وعدہ دیا جاتا ہے کہ حق کو مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر وہ ضرور غالب آئے گا اور باطل کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ [آیت نمبر: 13] میں اَرْضِنَآ سے مراد خاص وہ ملک ہے جہاں مخالفین کا غلبہ ہے مگر [آیت نمبر: 14] میں الْاَرْضَ وسیع ہے۔ حق کو قائم کر دیا جائے گا خواہ کہیں ہو۔ اسی جگہ پر واپس لانے کا وعدہ رسول اللہ ﷺ سے خاص تھا۔ ﴿لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ﴾ [القصص: 85:28] ''وہ یقیناً تجھے لوٹ کر آنے کی جگہ واپس لائے گا'' اور ﴿لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 1122] ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کا نزول اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جب آنحضرت ﷺ کے اخراج کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔

1644 - ﴿اسْتَفْتَحُوْا﴾۔ اِسْتِفْتَاحٌ فتح سے ہے جس کے معنی زنجیروں بیڑیوں کا دور کرنا ہیں یعنی کھولنا اور یہ جسمانیات پر بھی بولا جاتا ہے یعنی جو چیزیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور علوم وغیرہ پر بھی یعنی جو بصیرت سے تعلق رکھتی ہیں اور [فَتْحُ الْقَضِیَّةِ فَتَاحًا] کے معنی ہیں مقدمہ کا فیصلہ کر دیا گویا اس کی زنجیریں یا مشکلات وغیرہ کو دور کر دیا ﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ﴿۸۹﴾﴾ [الأعراف: 89:7] ''اے ہمارے رب! ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔'' اور فتح بمعنی ظفر و نصرت بھی آتا ہے اور اِسْتِفْتَاحٌ کے معنی [طَلَبُ الْفَتْحِ] بھی ہوسکتے ہیں اور [طَلَبُ الْفَتَاحِ] بھی یعنی فتح چاہنا یا فیصلہ چاہنا۔ (غ)

استفتاح انبیاء علیہم السلام بھی کرتے ہیں جیسے ﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ﴾ [الأعراف: 89:7] سے ظاہر ہے اور ان کے

مِّنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾

اس کے سامنے دوزخ ہے اور اسے کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔ (1645)

يَّتَجَرَّعُهٗ وَ لَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَ مِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

وہ اسے گھونٹ گھونٹ پیے گا اور اسے گلے سے نہیں اتار سکے گا اور ہر طرف سے اسے موت آ رہی ہوگی اور وہ مرے گا نہیں اور اس کے سامنے سخت عذاب ہوگا۔ (1646)

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ

ان لوگوں کی مثال جو اپنے رب کا انکار کرتے ہیں (یہ ہے

مخالف بھی جیسے ﴿رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا﴾ [صٓ: 16:38] ''اے ہمارے رب! ہمارا حصہ ہمیں جلد دے دے۔'' ﴿فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ﴾ [الأعراف: 70:7] ''تو ہم پر لے آ جو تو ہمیں وعدہ دیتا ہے۔'' اور جنگ بدر کے لیے جب قریش نکلے تو اس وقت ابوجہل نے بھی دعا کی تھی [دیکھو نمبر: 1219]۔

1645 - ﴿صَدِيْدٍ﴾۔ صَدَّ اور صُدُوْدٍ کسی چیز سے روکنا یا رکنا ہے اور صَدِيْدٌ پیپ وغیرہ کو کہا جاتا ہے جو چمڑے اور گوشت کے درمیان حائل ہو اور یہ دوزخیوں کے طعام کے لیے بطور مثال بیان کیا گیا ہے۔ (غ) اور صَدِيْدٌ اس گرم پانی کو بھی کہا جاتا ہے جو ابالا گیا ہو۔ یہاں تک کہ وہ گاڑھا ہو جائے اور تلچھٹ کو بھی۔ (ل)

1646 - يَتَجَرَّعُ۔ جَرِعَ اور تَجَرَّعَ پانی کے نکلنے پر بولا جاتا ہے اور جُرْعَةٌ اور جَرْعَةٌ ایک گھونٹ اور ایک مرتبہ پینے کو کہتے ہیں۔ (ل) اور نہایہ میں ہے کہ تَجَرُّعٌ کے معنی ہیں جلدی سے پانی پی جانا اور بعض کے نزدیک گھونٹ گھونٹ پینا معنی ہیں۔

يُسِيْغُ۔ سَاغَ کھانے یا پانی پینے پر بولا جاتا ہے جو گلے سے آسانی سے اتر جائے ﴿سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ﴾ [النحل: 66:16] ''جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے۔''

جب استفتاح کا نتیجہ یہ فرمایا کہ حق کو نابود کرنے کی کوشش کرنے والے نامراد ہو جائیں گے تو اس عذاب دنیا کے بعد عذاب جہنم کا ذکر کیا۔ موت کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 79] اور یہاں مراد وہ دکھ اور مصائب ہیں جو موت تک پہنچا دیتے ہیں۔ مگر چونکہ موت وہاں نہیں ہے اس لیے وہ مرتا نہیں ﴿لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ۝﴾ [طٰہٰ: 74:20] ''وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔''

﴿مِنْ وَّرَآىِٕهٖ﴾ کے معنی آگے اور پیچھے دونوں ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ﴿مِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ﴾ میں عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔

كَرَمَادِ ِاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾

کہ) ان کے عمل راکھ کی طرح ہیں جس پر آندھی کے دن ہوا زور سے چلے جو کچھ انہوں نے کمایا تھا اس میں سے کوئی چیز ان کے ہاتھ نہ آئے گی۔ یہ پرلے درجہ کی گمراہی ہے۔ (1647)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ۙ

کیا تو غور نہیں کرتا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے۔ (1648)

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾

اور یہ اللہ پر کچھ بھی مشکل نہیں۔

وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۲۱﴾ ع 3 9 15

اور سب اللہ کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔ تب کمزور انہیں جو متکبر تھے کہیں گے ہم تمہارے پیرو تھے تو کیا آج تم کچھ اللہ کا عذاب ہم سے دور کر سکتے ہو؟ وہ کہیں گے اگر اللہ ہمیں راہ دکھاتا تو ہم تمہیں راہ دکھاتے۔ ہمارے لیے برابر ہے کہ ہم واویلا کریں یا صبر کریں ہمارے لیے کوئی گریز کی جگہ نہیں۔ (1649)

1647 - ﴿يَوْمٍ عَاصِفٍ﴾ عَاصِفٍ اصل میں ہوا کی صفت ہے [دیکھو نمبر: 1387]۔ یوم کی طرف اس کا اسناد بطور مجاز ہے۔
کافروں کے اعمال کو راکھ سے مثال دی ہے جو ایک تیز ہوا کے سامنے اڑ جاتی ہے اس لیے کہ ان کی ساری دوڑ خواہشات حیوانی تک تھی۔ اس کے خاتمہ کے ساتھ ہی وہ عمل بھی برباد ہو گئے اور آخرت میں کچھ کام نہ دیں گے۔

1648 - آیت کے دونوں حصوں میں کیا تعلق ہے؟ حق کے ساتھ زمین و آسمان کو پیدا کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہر فعل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اس لیے انسانوں کے افعال بھی بلا نتیجہ نہیں رہ سکتے۔ اور ایک قوم کے اعمال و افعال ہی اس کے زوال کا موجب ہوتے ہیں۔

1649 - تَبَعًا - تابع کی جمع ہے۔

وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

اور جب بات کا فیصلہ ہو جائے اور شیطان کہے گا اللہ نے تمہیں سچا وعدہ دیا تھا اور میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا تو تم سے وعدہ خلافی کی اور میرا تم پر کوئی غلبہ نہ تھا۔ مگر میں نے تمہیں بلایا تو تم نے میری بات مان لی، سو مجھے ملامت مت کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔ نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو۔ میں اس کا انکار کرتا ہوں جو تم نے پہلے مجھے شریک بنایا۔ ظالموں کے لیے دردناک دکھ ہے۔(1650)

﴿لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ﴾ یہاں راہ دکھانے سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ راہ حق دکھاتے مگر سیاق یہ چاہتا ہے کہ اس سے مراد عذاب سے مخلصی کی راہ ہے۔ کیونکہ ان کا سوال یہ ہے کہ کیا تم کچھ عذاب ہم سے دور کر سکتے ہو۔

جَزِعْنَآ۔ جَزَعَ کے اصل معنی رسہ کا درمیان سے کاٹ دینا ہیں اور جَزَعَ اس حزن یا غم کو کہتے ہیں جو انسان کو اپنے سامنے کی چیز سے پھیر دے اور اسے اس سے کاٹ دے۔ (غ) اور یہ صبر کے مقابل پر ہے حزن اور صبر جمع ہو سکتے ہیں مگر جَزَعَ اور صبر جمع نہیں ہو سکتے۔

مَّحِيْصٍ۔ حَيْصَ کے معنی ہیں ایک چیز سے الگ ہو جانا اور [مَحِيْصٌ مَهْرِبٌ] یعنی بھاگنے کی جگہ۔ (ل) اور [حَيْصَ بَيْصَ] کے معنی شدت ہیں۔

1650 - مُصْرِخ۔ صَرْخَةٌ۔ اس زور کی آواز کو کہتے ہیں جو مصیبت کے وقت دوسرے کو مدد کو بلانے کے لیے بلند کی جاتی ہے۔ اور صَارِخَ فریاد کرنے والا اور مُصْرِخٌ وہ جو فریاد سن کر مدد کو آئے اور صَرِيْخَ دونوں پر بولا جاتا ہے ﴿فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ﴾ [يٰسٓ: 43:36] ''تو ان کے لیے نہ کوئی فریاد رس ہوگا۔''

شیطان کا انکار شرک:

﴿اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ﴾ کے ایک معنی تو وہ ہیں جو ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ خدا کا شریک ہونے کا میں پہلے ہی منکر تھا یا میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں خدا کا شریک ہوں یا تم مجھے خدائی طاقتوں میں اس کا شریک مانو اور یہ معنی بالکل سیاق کے مطابق ہیں۔ کیونکہ اوپر وہ صاف کہتا ہے کہ اللہ کے وعدے تو سچے ہوتے تھے

وَ اُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

اور جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اپنے رب کے حکم سے انہی میں ہمیشہ رہیں گے ان میں ان کی دعائے ملاقات سلام ہوگی۔

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ

کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے اچھی بات کی مثال کس طرح بیان کی ہے جیسا ایک پاکیزہ درخت اس کی جڑ مضبوط ہے

اور میرے وعدے جھوٹے۔ پس اسی سے تم سمجھ سکتے تھے کہ اگر مجھ میں بھی کوئی خدائی طاقت ہوتو میں بھی اپنے وعدوں کو پورا کروں۔ اور اب جو تم مجھ سے مدد مانگتے ہوتو میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔ کیونکہ میں کوئی خدا کا شریک تو ہوں نہیں۔

چھوٹوں کی غلطی سے بڑے گمراہ ہوتے ہیں:

دوسرے معنی یوں ہوسکتے ہیں کہ میں نے جو خدا کا انکار کیا تو اس کی وجہ خود تمہارا شرک ہے۔ اگر تم مجھے خدا کا شریک نہ بناتے تو میں بھی اس کا کافر نہ ہوتا اور اس صورت میں شیطان سے مراد وہی سردار ہوگا جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہے ﴿اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا﴾ گویا جب کمزوروں نے بڑوں سے درخواست کی کہ ہم تمہاری بات مان کر تمہارے پیچھے چلا کرتے تھے، تو وہ بڑے یہ جواب دیتے ہیں کہ تمہارے پیچھے چلنے نے ہی تو ہمیں کافر بنایا۔ اور یہ بالکل سچ ہے کہ اکثر لوگ دنیا میں جو اپنے لیے خدا کی برابری کا دعویٰ کرتے ہیں اور جو چاہتے ہیں اپنے پیروؤں سے منواتے ہیں، تو اس کی وجہ عوام الناس کی حماقت ہوتی ہے۔ جب لوگ ایک شخص کو بڑا بنانا شروع کریں تو وہ کیوں بڑا نہ بنے۔ گویا جب عوام نے یہ کہا کہ ہم تمہاری پیروی کی وجہ سے ہلاک ہوئے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی بڑا بنانے سے کافر ہوئے اور کفر میں بڑھتے گئے۔ گویا تم ہماری ہلاکت کا موجب ہوئے۔ اور ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ میں اس بات کا انکار کرتا ہوں کہ تم نے مجھے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں شریک بنایا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو اچھے کاموں کا حکم دیتا تھا اور میں برے کاموں کی طرف بلاتا تھا۔

اس آیت میں یہ دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے سچے ہوتے تھے اور شیطان **کے وعدے جھوٹے** اور اس کا نظارہ ہم اس دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ **نیکی پر خوشی کا وعدہ جو اللہ تعالیٰ دیتا ہے ہمیشہ سچا ثابت ہوتا ہے اور بدی پر خوشی کا وعدہ جو شیطان دیتا ہے وہ ہمیشہ جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔** اور جو لوگ بدصحبت میں بیٹھ کر تباہ ہوتے ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ جس جس شیطان نے جو جو کہہ کر ان کو بدی کی طرف مائل کیا تھا وہ آخر کار سب جھوٹ نکلا۔ دوسری بات یہ ہے کہ شیطان کا نیکوں پر تو کیا بدوں پر بھی کوئی تسلط نہیں۔ وہ صرف ایک تحریک ہوتی ہے جو انسان اپنی بدبختی سے جھٹ پٹ قبول کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان پر شیطان کو مسلط نہیں کیا بلکہ لوگ خود اس کا اتباع اختیار کرتے ہیں۔

وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ اور اس کی شاخیں آسمان میں (پھیلی ہوئی) ہیں۔ (1651)

تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وہ اپنے رب کے حکم سے اپنا پھل ہر موسم میں دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

1651 - اَصْلُ۔ کسی چیز کا اَصْلَ اس کا سب سے نیچے کا حصہ ہے۔ (ل) یا وہ چیز جو اس کے لیے بطور بنیاد کے ہے کہ اگر اس کو اٹھایا جائے تو ساری شے ساتھ اٹھ جائے۔ (غ)

فَرْعُ کے معنی شاخ ہیں اور اس کی جمع فُرُوْعٌ ہے اور یہ دو لحاظ سے ہے ایک طول یعنی بلندی کے لحاظ سے۔ کیونکہ فَرَعَ کے معنی طَالَ ہیں اور دوسرا بلحاظ عرض جیسے تَفَرَّعَ کے معنی پھیل گیا۔

اس آیت میں کلمہ طیبہ اور [آیت:26] میں کلمہ خبیثہ کی مثال دی ہے جس سے مراد حق اور باطل ہیں۔ کلمہ طیبہ سے کسی نے لا الہ الا اللہ کسی نے قرآن، کسی نے دعوت الی الاسلام مراد لی ہے۔ مگر کلمہ حق میں یہ سب کچھ داخل ہے۔ ایسا ہی کلمہ خبیثہ سے مراد کفر، کذب وغیرہ لیا گیا ہے جو سب کچھ باطل میں داخل ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ حق بات کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑ زمین میں مضبوط لگی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہوں، یعنی بلند بھی ہوں اور ویسے بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔ یہ مثال صرف سمجھانے کے لیے ہے آیا مراد اس سے کھجور کا درخت ہے؟ صحیح حدیث میں مسلم کی مثال کھجور کے درخت سے دی ہے کیونکہ اس کی کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ مگر یہاں مسلم کی مثال نہیں بلکہ حق بات کی مثال ہے اور اس میں سمجھایا ہے کہ جس طرح ایک درخت جس کی جڑ زمین میں لگی ہوئی ہو اس کی شاخیں آسمان میں پھیل جاتی ہیں۔ **اسی طرح کلمہ حق ہوتا ہے کہ اس کا اصل مضبوط ہوتا ہے اور اس کی فروع سب اس اصل سے تعلق رکھتی ہیں گو کتنی بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔** پس وہ فروع سب ایک اصل کے ماتحت ہوتی ہیں اور اصل اور فروع کا تعلق اسی طرح دلائل عقلی سے روشن ہوتا ہے جس طرح درخت کی جڑ اور شاخوں کا تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس کی مثال میں یہ بھی سمجھایا ہے کہ جس طرح درخت کی جڑ پانی کے ذریعہ سے غذا حاصل کرتی ہے اور اس کی آسمان میں پھیلی ہوئی شاخیں ہوں اور دھوپ وغیرہ سے بھی ساتھ ساتھ اپنی غذا حاصل کرتی چلی جاتی ہیں۔ اسی طرح حق کے اصل اصول تو وحی الٰہی سے قائم ہوتے ہیں جو بمنزلہ پانی کے ہے۔ مگر اس کی فروع کو علاوہ اس غذا کے حالات پیش آمدہ سے بھی جو ان کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہوتے ہیں غذا ملتی رہتی ہے یہ اجتہاد کے ذریعہ سے ان فروع کا نشوونما پانا ہے۔

اشجار بہشت اعمال انسانی سے پیدا ہوتے ہیں:

یہاں بہشت کے ذکر کے بعد فوراً اس مثال کو بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مثال کا تعلق بہشت سے بھی ہے۔

وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اِجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

اور ناپاک بات کی مثال گندے درخت کی طرح ہے جو زمین کے اوپر سے ہی اکھاڑ پھینکا جائے اس کو کچھ بھی قرار نہیں۔ (1652)

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ۬ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾ ع 4 6 16

اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں یقینی بات کے ساتھ مضبوط کرتا ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور اللہ ظالموں کو ہلاک کرتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ (1653)

بہشت کا نقشہ عموماً ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور یہاں کلمہ حق کو درخت سے مثال دے کر بتادیا کہ بہشت کے درخت اور ثمرات اسی کلمہ حق کا ہی نتیجہ ہے جس کو قبول کر کے انسان اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ گویا ہر کلمہ حق بمنزلہ ایک بیج کے ہے۔ جس سے ایک ایسا درخت بن جاتا ہے جو ہمیشہ اپنا پھل دیتا رہتا ہے۔ [آیت نمبر: 25] یعنی دنیا کے درختوں کی طرح نہیں کہ سال میں ایک آدھ دفعہ پھل دے دیا بلکہ اس کا پھل ہر وقت موجود رہتا ہے۔ یہی انسان کے اعمال ہی آخر کار باغوں اور پھلوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ہاں اس عالم میں وہ زیادہ تر نظروں سے مخفی رہتے ہیں۔ عالم آخرت میں کھلے کھلے نظر آجاتے ہیں گویا ہر شخص کے اعمال کے مطابق ہی اس کے لیے بہشت تیار ہوتا ہے۔

1652 - ﴿اِجْتُثَّتْ﴾۔ کسی چیز کا جُثَّةٌ اس کا وہ وجود ہے جو نظر آ رہا ہو اور اِجْتِثَاثٌ اس کے جُثَّةٌ کا نکال پھینکنا ہے۔

جس طرح حق بات کی مثال ایک مضبوط جڑ والے درخت سے دی ہے باطل کی مثال اس درخت سے دی ہے جس کی جڑ زمین کے اندر مضبوط نہیں بلکہ ذرا سے مقابلہ پر وہ سارے کا سارا اکھڑ جاتا ہے اور **یہی باطل کا قاعدہ ہے کہ اسے قیام کچھ نہیں ہوتا۔** ایک دلیل سے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ان دو مثالوں کو لا کر یہ بتایا کہ قرآن کی حقانیت ایسی زبردست ہے کہ کوئی دلائل اسے توڑ نہیں سکتیں بلکہ جوں جوں عقلی دلائل ترقی کریں گے توں توں اس کی مضبوطی اور اس کی شاخوں کی بلندی ظاہر ہوتی جائے گی اور باطل کو کبھی بھی قرار نہیں ہوگا۔ یہی حال تمام ان عقائد کا ہے جو اسلام کے خلاف ہیں کہ وہ کسی اصل کے ماتحت نہیں اس لیے فوراً گر جاتے ہیں۔

1653 - اس آخری آیت میں بتادیا کہ اصول حقہ کا یہ اثر مومن کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے یہاں بھی اور آخرت میں۔ پس جس شخص کو ایسی مضبوطی حاصل نہیں اس کا ایمان بھی ناقص ہے۔

﴿يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ﴾ میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام سے تو لوگوں کو مضبوط ہی کرتا ہے مگر جو لوگ خود ظلم کا طریق اختیار کرتے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدلا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اتارا۔(1654)

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ؕ وَ بِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾

(یعنی) دوزخ میں اس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

اور اللہ کے شریک بناتے ہیں تاکہ اس کے رستہ سے گمراہ کریں، کہہ (دنیا میں) فائدہ اٹھالو آخر کار تمہیں دوزخ کی طرف ہی جانا ہے۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں کہہ دے کہ وہ نماز کو قائم کریں اور اس سے جو ہم نے ان کو دیا ہے چھپے اور کھلے خرچ کریں اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جن میں نہ لین دین ہوگا اور نہ دوستی کام آئے گی۔(1655)

ہیں انہیں ان کی گمراہی کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے جس کا نتیجہ ہلاکت ہوتا ہے۔

1654 - بَوَارٍ۔ کَسَادَ یا سرد بازاری کا بہت ہو جانا ہے۔ اس لیے اس کے معنی ہلاکت ہو گئے ہیں بَارَ يَبُوْرُ ﴿تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ﴾[فاطر: 29:35] ''ایسی تجارت جو تباہ نہیں ہوگی۔'' ﴿وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ﴾[فاطر: 10:35] ''اور ان کی مخفی تدبیر ملیا میٹ ہو جائے گی۔'' ﴿وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا﴾[الفتح: 12:48] ''اور تم ہلاک شدہ قوم تھے۔''

نعمت سے مراد وحی الٰہی یا قرآن ہے اور اس کے تبدیل کرنے سے مراد اس کا قبول نہ کرنا اور اس کی جگہ کفر کا لینا ہے گویا اس نعمت کو دے کر کفر لیا۔ یہ اہل مکہ کی طرف اشارہ ہے جو اَب نعمت الٰہی کی قبولیت کی جگہ رسول اللہ ﷺ کو جو اس نعمت کے لانے والے تھے گھر سے نکال رہے تھے۔ جس کا نتیجہ ان کی قوم پر ہلاکت کا آنا ہوا۔

1655 - نماز کا قائم کرنا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ان مشکلات کا علاج بتایا جو کفار کی طرف سے اس وقت پیش آ رہی تھیں۔ بیع اور خلت کے نہ ہونے پر [دیکھو نمبر: 328]۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ﴿۳۲﴾

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے پانی اتارا پھر اس کے ساتھ تمہارے لیے پھلوں سے رزق نکالا اور کشتیوں کو تمہارے کام میں لگایا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں اور دریاؤں کو تمہارے کام میں لگایا۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ۚ﴿۳۳﴾

اور سورج اور چاند کو جو ایک قانون پر چل رہے ہیں تمہارے کام میں لگایا اور رات اور دن کو بھی تمہارے کام میں لگایا۔

وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾ ع 5 7 17

اور جو کچھ تم اس سے مانگو اس میں سے تمہیں دیتا ہے اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انہیں گن نہ سکو گے یقیناً انسان بڑا ہی ظالم بڑا ناشکر گزار ہے۔ (1656)

1656 - تُحْصُوْا۔ حَصٰی۔ کنکری کو کہتے ہیں اور چونکہ پہلے کنکریوں سے گنتی کی جاتی تھی (یا چونکہ کنکریوں سے گنتی سکھائی جاتی ہے) اس لیے اِحصَاء کے معنی گنتی کے ذریعہ سے کسی چیز کا حاصل کر لینا یا اس کا احاطہ کر لینا ہیں ﴿وَ اَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا﴾ [الجن: 28:72] ''اور ہر چیز اس نے گن کر محفوظ کر رکھی ہے۔'' ﴿عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ﴾ [المزمل: 20:73] ''وہ جانتا ہے کہ تم اس کی حفاظت نہ کر سکو گے۔''

ظَلُوْمٌ اور كَفَّارٌ۔ ظالم اور کافر سے مبالغہ کے صیغے ہیں۔ بڑا ظالم، بڑا ناشکر گزار۔

سورج چاند وغیرہ کی تسخیر:

اوپر کی دونوں آیتوں میں جب یہ ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کشتیوں اور دریاؤں کو، سورج اور چاند کو، رات اور دن کو انسان کے لیے مسخر کر رکھا ہے اور اس کے کام میں لگا دیا ہے تو یہاں اس کو عام کر کے بیان فرمایا کہ یہ کیا ہر چیز کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور تم اس سے فائدہ اٹھاتے ہو۔ ہاں ان چیزوں سے پھر تم اس قدر فائدہ اٹھاتے ہو جس قدر مانگو اور وہ مانگنا اپنے عمل سے ہے۔ ہوائیں، بادل، بجلیاں، آگ، پانی یہ سب چیزیں انسان کی خدمت میں لگائی ہیں۔ کیونکہ انسان ان سے منفعت حاصل کرتا

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾

اور جب ابراہیم نے کہا میرے رب! اس شہر کو امن والا بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پرستش کریں۔ (1657)

ہے۔ مگر پھر جس قدر زیادہ ان سے وہ خود کام لے لے اسی قدر زیادہ نفع اٹھائے گا۔ پس جس طرح دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ کی روحانی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، ان کو کیوں ظلم اور ناشکری سے پھینکتے ہو۔ وحی الٰہی اسی طرح تمہیں روحانی طور پر فائدہ پہنچانے والی چیز ہے جس طرح جسمانی رنگ میں یہ نعمتیں۔ اس لیے جب تم اسے رد کرتے ہو تو اس کے فائدے سے محروم ہو کر اسی طرح دکھ اٹھاتے ہو جس طرح جسمانی نعمتوں سے محروم ہو کر بھی نتیجہ دکھ ہوتا ہے اور دوسری طرف اس میں یہ بھی سمجھایا ہے کہ جن چیزوں کو تم اپنا معبود بناتے ہو اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہاری خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔

1657- **سلسلۂ نبوت کا نظم:** اس سارے رکوع میں صرف اس دعا کا ذکر ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ اور اہل مکہ کے لیے اور اپنی اولاد کے لیے کی۔ اور اس سے پہلے اور پیچھے دونوں طرف مخالفت حق اور اس کے انجام کا ذکر ہے۔ یہ مضمون بے تعلق نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مذہب اور وحی الٰہی کا سلسلہ سب ایک نظم میں منسلک ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اسی رادہ کے مطابق دنیا میں مبعوث فرمایا ہے جو وہ مدتوں پیشتر انبیاء پر ظاہر فرما چکا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام گویا ایک جڑ کی طرح ہیں کیونکہ وہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل کے لیے بطور جد کے ہیں اور یوں گویا یہ بھی ایک تشریح ہے اس اصول کی جو [آیت: 24] میں بیان فرمایا کہ حق ایک درخت کی طرح ہے جس کی جڑ زمین میں قائم ہے اور شاخیں چاروں طرف آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذہب کا اصل الاصول بھی وہی توحید الٰہی تھا جو سب مذاہب کے لیے بطور ایک جڑ کے ہے۔ کوئی مذہب نہیں جس نے ایک خدا کے ساتھ تعلق قائم کرنے کو بطور اصل اور جڑ نہ ٹھہرایا ہو۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں بھی سب سے پہلے ذکر توحید الٰہی کا کیا۔ ہاں اس توحید کے ذکر کے ساتھ یہ بھی دعا ہے کہ مکہ امن والا شہر ہو۔ اس لیے کہ اس میں خانہ کعبہ تھا، جو وہ بھی توحید کے لیے بطور نشان ابتدائے عالم سے قائم کیا گیا اور ایک خدا کی پرستش کا سب سے پہلا معبد دنیا میں یہی ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا عصمت انبیاء کے خلاف نہیں۔ اس لیے کہ وہ عصمت حاصل ہی اس سے ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتے اور اس سے مدد طلب کرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے حفاظت الٰہی ان کے شامل حال رہتی ہے۔ **عصمت انبیاء** کا اگر یہ مطلب ہوتا کہ وہ کوئی علیحدہ قویٰ کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں تو انبیاء علیہم السلام کی عصمت ہمارے لیے کچھ مفید نہ ہو سکتی تھی۔ ان کی عصمت کا راز ہی یہ ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر حال میں حفاظت الٰہی طلب کرتے رہتے ہیں اور اپنے نفس پر بھروسہ نہیں کرتے اور ان کی عصمت کے اس راز کو سمجھ کر ہی ہم بھی گناہوں سے بچ سکتے ہیں کہ ان کی طرح اپنے نفسوں پر بھروسہ نہ کریں بلکہ ہر حال میں حفاظت الٰہی کے طالب ہوں۔ [فَلاَ تَكِلْنِي إِلَى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ] (سنن ابی داؤد، کتاب

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾

میرے رب! انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے، سو جو میری پیروی کرے تو وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تُو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1658)

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾

ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے عزت والے گھر کے پاس اس وادی میں بسایا ہے جہاں کھیتی نہیں۔ ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں سو تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں سے رزق دے تاکہ وہ شکر کریں۔ (1659)

الادب، باب مَا يَقُولُ إِذَا أَصْبَحَ، حديث:5092) نبی کریم ﷺ کی دعا ہمارے لیے کیسی اچھی تعلیم ہے۔

1658- آیت کے پہلے حصہ میں بتوں کو لوگوں کے گمراہ کرنے والے ٹھہرایا اور یہ اسناد بطور مجاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بت پرستی سے لوگ گمراہ ہو گئے ورنہ بت تو بے جان ہیں وہ گمراہ نہیں کرتے۔ پچھلے حصہ میں انبیاء کی وسعت قلبی اور رحم دلی کا نقشہ ہے۔ وہ نافرمانوں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی صفت غفر اور رحم کا ہی ذکر کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا میں آپ کے اس فرزند کی حالت قلبی کا بھی نقشہ کھینچا ہے جو رحمۃ للعالمین کر کے بھیجا گیا۔ اس لیے اس کے دشمن یوں تباہ نہ ہوئے جیسے انبیائے سابق کے مخالفوں کی ہلاکت کا نقشہ قرآن شریف نے کھینچا ہے۔ بلکہ زیادہ حصہ اللہ تعالیٰ کے غفر اور رحم کی صفات کے نیچے آ کر ہدایت پر آ گیا۔ اور چونکہ جو نقشہ حق کے مخالفین کی ہلاکت کا اس سورت میں کھینچا ہے اس میں خاص مقصود تو نبی کریم ﷺ کے دشمن ہیں اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا میں یہ بتایا ہے کہ کچھ ہلاک ہو کر بہت غفر اور رحم کے نیچے آ جائیں گے۔

1659- ﴿تَهْوِيْٓ﴾۔ هَوَى کے ایک معنی [نمبر:964] میں بیان ہو چکے ہیں۔ اور گو یہ لفظ مطلق عموماً مذموم ہوتا ہے یعنی ادنیٰ یا گری ہوئی خواہشات پر بولا جاتا ہے مگر اچھے معنی میں بھی اس کا استعمال ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے متعلق [تَقَرَّبَ إِلَى اللهِ بِهَوَاهُ] اپنی ہوای یعنی محبت سے اللہ کا قرب حاصل کیا اور اچھے کاموں کی محبت کے متعلق ہی اس کا استعمال رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی ہوا ہے۔ جیسے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں [يُسَارِعُكَ رَبُّكَ فِيْ هَوَاكَ] یعنی جن اچھی باتوں کی طرف آپ کا میلان ہے ان میں آپ کا رب آپ کو بہت جلد عطا فرماتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ هَوَى کے معنی کسی چیز کی محبت اور اس کا دل پر غالب آ جانا ہیں۔ (ل) حدیث میں ہے [يَأْخُذَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنَ الْبَيْعِ مَا هَوِيَ] جس کے معنی ہیں [مَآ اُحِبُّ] یعنی جس چیز سے محبت کرتا ہے۔ (ن) اور [هَوَى يَهْوِيْ هَوِيًّا] اور هُوِيًّا دونوں طرح آتا ہے۔ اور هَوِيٌّ کے معنی نیچے کی طرف آنا

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَ مَا نُعْلِنُ ؕ وَ مَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾

ہمارے رب تو جانتا ہے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور اللہ پر کوئی چیز بھی چھپی نہیں رہتی (نہ) زمین میں اور نہ آسمان میں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں باوجود اسماعیل اور اسحاق دیئے یقیناً میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔

ہیں اور هُوِیّ کے معنی اوپر کی طرف جانا یا اس کے خلاف اور [هَوَی یَهْوِیْ] کے معنی چلنے میں تیزی بھی ہیں اور ﴿تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ﴾ میں معنی ان کی طرف مائل ہونے کے بھی کیے گئے ہیں اور بلند ہونے کے بھی۔ اور ان کا ارادہ کرنے کے بھی اور ان کی طرف جلدی کرنے کے بھی۔ (ل) اور هَوَآءٌ وہ ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان ہے۔ اور [آیت نمبر: 43] میں ﴿اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ﴾ اسی لحاظ سے ہے یعنی جیسے خلا میں ہوا ہوتی ہے۔ (غ) گویا وہ خالی ہیں یعنی عقل سے خالی یا خوف کی وجہ سے کسی چیز کو محفوظ نہ رکھ سکیں گے۔ (ل)

یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے خانہ کعبہ کے پاس چھوڑنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں لفظ اَسْكَنْتُ لا کر بتا دیا ہے کہ یہ چھوڑنا محض اخراج کے طور پر نہ تھا بلکہ مصلحت الٰہی کا تقاضا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا ایک حصہ یہاں آباد ہو اور حدیث میں بھی ہے کہ یہ چھوڑنا حکم الٰہی سے تھا۔ اور ﴿بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ﴾ اسے کہا اس لیے کہ وہ پتھریلی زمین ہے جہاں سبزی وغیرہ نہیں ہوتی اور بارش بھی بہت کم ہوتی ہے۔ اس لیے وہ زراعت کے لیے موزوں نہ تھی۔ اس لفظ کے لانے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ انہیں محض رضائے الٰہی کے ماتحت یہاں چھوڑا ہے کسی غرض دنیوی کے لیے نہیں۔ اسی کی تائید کے لیے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ﴿لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ یعنی غرض یہ ہے کہ قیام صلوٰۃ ہو جس میں حصول رضائے الٰہی مدنظر ہے نہ کوئی دنیوی غرض۔ اور ﴿عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾ کے لفظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیت الحرام یعنی خانہ کعبہ وہاں موجود تھا۔ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنانے کا جو ذکر ہے اس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شمولیت موجود ہے ﴿وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ﴾ [البقرۃ: 127:2] ''اور جب ابراہیم گھر کی بنیادیں اٹھاتا تھا اور اسماعیل (بھی)۔'' لیکن جب اسماعیل کو وہاں چھوڑا تو ان کی عمر چھوٹی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں مکہ کہ رہنے والوں کے لیے محبت کا پیدا کرنا خود خانہ کعبہ کی محبت کے قائم مقام ہے۔ یہ دعا بھی کیا عجیب ہے **اس مقام کے لیے، جذب اور کشش پیدا ہونے کی دعا ہے** جہاں کوئی بھی ظاہری سامان کشش کا نہیں۔ یہاں تک کہ وہ جگہ زراعت سے بھی خالی ہے۔ یہ اس لیے ہوا تا ایک اللہ کے نام کے سوائے یہاں کوئی دوسری کشش نہ ہو اور صرف دینی فوائد کے لیے ہی یہ جگہ مخصوص رہے۔ ہاں یہ بھی دعا ہے کہ کھانے کو بھی انہیں ملتا رہے۔ گو وہ اشیائے خوردنی وہاں باہر سے ہی

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾

میرے رب مجھے نماز کا قائم کرنے والا بنا اور میرے اولاد میں سے (بھی) ہمارے رب اور میری دعا کو قبول فرما۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ ع 6 7 18

ہمارے رب! میری حفاظت فرما اور میرے ماں باپ کی اور مومنوں کی بھی جس دن حساب قائم ہو۔ (1660)

وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾

اور اللہ کو اس سے بے خبر نہ سمجھو جو ظالم کرتے ہیں۔ وہ صرف ان (کے معاملہ) کو اس دن تک پیچھے ڈال رہا ہے۔ جب آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ (1661)

جائیں۔ اگلی آیت میں یہ بتایا ہے کہ نیت اور ارادہ کا جاننے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ ہماری نیتوں میں کوئی دنیا کی ملونی نہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو ایسا بابرکت کیا کہ ساری دنیا کے دل اس کی طرف کھچے چلے جاتے ہیں۔

1660 - یہ ضروری نہیں کہ یہ ساری دعا ایک ہی موقعہ کی ہو۔ اس کا آخری حصہ جو [آیت: 39] سے شروع ہوتا ہے بڑھاپے کے زمانے کا ہے جب حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام دونوں پیدا ہو چکے ہیں اور اس وقت ماں اور باپ کے لیے دعائے استغفار کرنا صاف بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے جس آبؔ کا ذکر دوسری جگہ ہے وہ کوئی اور بزرگ تھے کیونکہ ان سے بعد میں بیزاری کا اظہار بھی کیا تھا ﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ﴾ [التوبة: 114:9] ''پھر جب اس پر کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے وہ اس سے الگ ہو گیا۔''

1661 - يُؤَخِّرُ - تاخیر ضد تقدیم ہے یعنی کسی معاملہ کا پیچھے لانا۔

تَشْخَصُ۔ شَخْصَ انسان کا سواد ہے جو دور سے نظر آتا ہے۔ اور ہر جسم جس کے لیے ارتفاع اور ظہور ہو۔ اس لیے شَخَص کے معنی اِرتَفَعَ آتے ہیں یعنی ایک چیز بلند ہو گئی اور [شَخَصَ الْبَصَرُ] کے معنی ہیں آنکھ کھل گئی اس طرح کہ پھر جھپکی نہ جائے اور حدیث میں میت کے ذکر میں ہے [شَخَصَ بَصَرُهٗ] جس سے مراد ہے پلکیں اوپر اٹھ گئیں اور نظر محدود ہو گئی۔ (ل) ﴿فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ [الأنبيآء: 97:21] ''تو ناگاہ ان کی آنکھیں جو کافر ہیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔''

عذاب کے وقت کا نقشہ:

ظالم جو حق کو مٹانا چاہتے ہیں جب اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتے چلے جاتے ہیں تو اکثر دلوں میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ دیکھتا نہیں پھر انہیں پکڑتا کیوں نہیں۔ جس کا جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ ان کے معاملہ

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾

بھاگے جارہے ہوں گے اپنے سر اٹھائے ہوئے ان کی نگاہ ان کی طرف نہ پھرے گی اور ان کے دل خالی ہوں گے۔ (1662)

وَ اَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾

اور اس دن سے لوگوں کو ڈرا جب ان پر عذاب آ جائے گا جو ظالم ہیں کہیں گے ہمارے رب ہمیں ایک قریب وقت تک تاخیر دے ہم تیری دعوت کو مانیں اور رسولوں کی پیروی کریں اور کیا تم پہلے قسمیں نہ کھایا کرتے تھے کہ تم پر زوال نہیں آئے گا۔ (1663)

میں تاخیر کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دن آ پہنچتا ہے جب آنکھیں پھٹی رہ جاتی ہیں اور وہ موت کا وقت ہے۔ مراد اس سے یا تو واقعی مجرم کی موت ہوسکتی ہے اور یا عذاب کا دن جب اکثر دلوں پر وہ کیفیت وارد ہوتی ہے جس کا نظارہ موت کے وقت دیکھا جاتا ہے اور اگلی آیت سے ظاہر ہے کہ یہ عذاب کا دن ہے جب عذاب کی سختی سے مجرموں کی کیفیت اس شخص کی سی ہوجاتی ہے جو حالت نزع میں ہو۔

1662 - ﴿مُهْطِعِيْنَ﴾۔ هَطَعَ اور اَهْطَعَ کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف آیا اپنی آنکھ اس پر ٹکائے ہوئے اور اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ خوف سے دوڑتا ہوا اور یہ صرف خوف کی حالت پر بولا جاتا ہے اور ایک قول میں مُهْطِعَ وہ ہے جو عاجزی اور ذلت کی حالت میں دیکھے اور مُقْنِعَ وہ جو سر اٹھائے ہوئے ذلت کی حالت میں دیکھے ﴿مُهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ﴾ [القمر: 8:54] ''پکارنے والے کی طرف دوڑے جاتے ہوں گے۔''

مُقْنِعِيْ۔ قَنَاعَةٌ تھوڑی چیز پر راضی ہوجانا ہے اور قَنُوْعٌ سوال کرنا ہے جس سے قانع ہے ﴿وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ﴾ [الحج: 36:22] ''اور سوال کرنے والے اور سوال نہ کرنے والے کو کھلاؤ۔'' جس سے مراد سائل ہے یا ایسا سائل جو تھوڑے پر راضی ہوجاتا ہے اور الحاح نہ کرے اور [اَقنِعْ رَاسَهٗ] کے معنی ہیں اپنا سر اٹھایا۔ کیونکہ قِنَاعٌ وہ ہے جس سے سر ڈھانکا جاتا ہے۔ (غ)

یہاں وہ نقشہ کھینچا ہے جب بڑے بڑے مغرور اور متکبر انسان آخر کار مغلوب ہوتے ہیں اور انہی لوگوں کے سامنے جن پر انہوں نے ظلم کیا تھا ذلت کی حالت میں آتے ہیں۔ شرمندگی کے مارے سر نیچا بھی ہے اور دہشت کی وجہ سے اٹھا ہوا بھی ہے۔

1663 - زَوَالٍ۔ زَالَ کے معنی ہیں ایک چیز اپنی حالت یا طریق سے الگ ہوگئی ﴿لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ [46] ﴿اِنْ تَزُوْلَا ۚ وَ لَئِنْ

وَّ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾

اور تم ان لوگوں کی جگہوں میں آباد ہوئے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور تمہارے لیے کھل چکا ہے کہ ہم نے ان سے کیا کیا اور ہم نے تمہارے لیے مثالیں بیان کیں۔ (1664)

وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

اور انہوں نے اپنی چال چلی اور ان کی چال اللہ کے اختیار میں ہے اور گو ان کی چال ایسی ہی ہو کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں۔ (1665)

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ ؕ

سو یہ گمان نہ کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے اپنے وعدے کا خلاف کرے گا، اللہ غالب سزا دینے والا ہے۔ (1666)

زَالَتَا﴾ [فاطر: 41:35] ''کہ وہ اپنے رستے سے ہٹ نہ جائیں۔ اور اگر وہ ہٹ جائیں۔'' اور زوال صرف اس چیز کے متعلق کہا جاتا ہے جو پہلے ثابت یعنی مضبوط ہو اور پھر وہ حالت اس کی بدل جائے اور زوال آفتاب بھی اسی لحاظ سے ہے کہ دوپہر کے وقت وہ ثابت معلوم ہوتا ہے۔ (غ)

یہاں صاف اشارہ ہے کہ مخالفین کے اقتدار اور قوت کے ٹوٹنے کا وقت آ جائے گا اس لیے ان کو وہ وقت یاد دلایا ہے جب اپنی طاقت کے نشہ میں سرشار وہ کہا کرتے تھے کہ ہماری قوت اور سلطنت کبھی زوال نہ دیکھے گی۔

1664 - اس سے مراد وہ قومیں ہیں جو پہلے عرب میں یا اس کے اردگرد حکمران تھیں جن کے تذکرے اور انجام قرآن شریف میں مذکور ہیں۔

1665 - **قریش کی تدابیر:** اس میں قریش کا ذکر ہے اور یہ ان کی چال وہی ہے جس کا ذکر دوسری جگہ فرمایا ﴿اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ﴾ [الأنفال: 30:8] ''جب وہ جو کافر ہوئے تیرے متعلق تدبیریں کرتے تھے تاکہ تجھے قید کریں یا تجھے قتل کریں یا تجھے نکال دیں۔'' اور یہ ان کی چال تو اس قدر مضبوط تھی کہ پہاڑوں کو بھی اڑا دیتے مگر اللہ جو سب سے طاقتور ہے اس کے اختیار میں ہی ہر بات ہے۔ اس لیے وہ ان کی چال کو سرسبز نہ ہونے دے گا۔ یہی معنی ہیں ﴿عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ﴾ کے۔

1666 - اس پر اس قدر زور اس لیے دیا کہ ابھی بڑی بڑی مشکلات رسول اللہ ﷺ کو پیش آنے والی تھیں۔ جہاں بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ دین اسلام کا خاتمہ ہو گیا اس لیے فرمایا کہ یہ کبھی ہو نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہو کر رہے گا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾

جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی اور (لوگ) اللہ اکیلے سب پر غالب کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔ (1667)

وَ تَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾

اور تُو اس دن مجرموں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھے گا۔ (1668)

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّ تَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾

ان کے کرتے رال کے ہوں گے اور ان کے مونہوں کو آگ ڈھانک لے گی۔ (1669)

1667 - **وعدہ عذاب دنیا کے لیے بھی ہے:** قرآن کریم میں جس قدر وعدے عذاب کفار کے ساتھ ہیں وہ آخرت پر بھی چسپاں ہو سکتے ہیں اور دنیا پر بھی۔ یہی زمین و آسمان کا بدل جانا قیامت میں بھی درست ہے۔ اور ایک معنی میں جب عرب اسلام کے سامنے جھک گئے اور چاروں طرف بت پرستی کی جگہ توحید کا نقارہ بج گیا۔ بتوں کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ شراب خوری اور زنا مٹ گئے۔ جہالت کی جگہ علوم کی نہریں بہنے لگیں تو یہ بھی واقعی زمین و آسمان کے بدل جانے کا ہی نظارہ تھا اور اگلی آیت میں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہونے کا نظارہ بھی جنگوں میں دیکھ لیا گیا۔

1668 - ﴿مُقَرَّنِيْنَ﴾۔ قَرَنَ یا اِقْتِرَانٌ دو یا زیادہ چیزوں کے اجتماع کا نام ہے اور قَرَّنَ میں تکثیر پائی جاتی ہے قَرِيْنٌ ہمنشین۔ قَرْنٌ نسل اسی معنی کے لحاظ سے ہیں ﴿اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ﴾ [الزخرف: 53:43] ''یا اس کے ساتھ فرشتے اکٹھے ہو کر (کیوں نہ) آئے۔''

اَصْفَادٍ - صَفَدٌ کی جمع ہے جس کے معنی زنجیر ہیں۔

1669 - سَرَابِيْلُ۔ سِرْبَالٌ کی جمع ہے۔ کرتہ کسی چیز کا بھی ہو۔ ﴿سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ﴾ [النحل: 81:16] ''کپڑے بنائے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور (ایسے) کپڑے جو تمہیں تمہاری جنگ میں بچاتے ہیں۔''

﴿قَطِرَانٍ﴾۔ قُطْرٌ کے معنی جانب ہیں جس کی جمع اقطار ہے ﴿اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ [الرحمٰن: 33:55] ''آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ۔'' ﴿وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا﴾ [الأحزاب: 14:33] ''اور اگر (دشمن) ان پر اس کی اطراف سے داخل ہوتا۔'' اور قَطَرَ اور تَقَطَّرَ کے معنی ہیں اپنی جانب پر گرا جس سے مراد بارش کا گرنا ہے اور

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾

تا کہ اللہ ہر نفس کو وہ بدلہ دے جو اس نے کمایا بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَ لِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ لِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾ ع 7 11 19

یہ لوگوں کو کھول کر پہنچا دینا ہے تا کہ وہ اس کے ذریعہ سے ڈرائے جائیں اور تا کہ وہ جان لیں کہ وہ صرف ایک ہی معبود ہے اور تا کہ خالص عقل والے نصیحت حاصل کریں۔ (1670)

قَطْرَانٌ وہ چیز ہے جو ہِنَاءٌ یعنی رال سے گرتی ہے اور ﴿اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا﴾ [الکھف: 96:18] ''مجھے پگھلا ہوا تانبا لا دو تا کہ اس کے اوپر ڈالوں۔'' میں قِطْرٌ پگھلا ہوا تانبا ہے۔ (غ)

1670 - **نتیجہ تبلیغ:** نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو شناخت کر لیں۔ سو ایسا ہی ہوا کہ کل عرب نے توحید الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا اور جو نظارہ عرب میں پیش آیا اس کو دنیا بھی عنقریب کسی نہ کسی رنگ میں دیکھ لے گی۔